مونوگراف
جگت موہن لال رواں
صغیر افراہیم

مونوگراف

جگت موہن لال رواں

صغیر افراہیم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	86/- روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1866

Jagat Mohan Lal Rawan

By: Sagheer Ifraheem

ISBN :978-93-5160-098-5

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔ میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔ میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلا سار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ

چودھری جگت موہن لال رواں شاعر تھے، نثر نگار تھے، قانون داں تھے، ماہر شکاریات تھے۔ وہ حسرت موہانی، عبدالماجد دریابادی، پریم چند، ثاقب کانپوری، جگر مرادآبادی اور جلیل قدوائی کے دوست تھے تو پھر کیوں رواں کی ہمہ جہت ادبی شخصیت آج بھی نیم تاریکی میں ہے؟ اثر لکھنوی، ظفر قدوائی، وحشی کانپوری اور عزیز لکھنوی کی کاوشوں کے باوجود اُن کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کیوں نہیں ہو سکا ہے؟ اِس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ایک بڑی وجہ ادب میں گروہ بندی ہے جس نے نہ جانے کتنی انمول شخصیتوں کو پردۂ خفا میں ڈھکیل دیا ہے یا پھر اُن کی نامکمل تصویر عوام کے سامنے آئی ہے۔ رواں کسی گروہ سے وابستہ نہ تھے شاید اِس لیے اُن کی شاعری کا شہرہ کم ہوا اور وہ ادبی canon (اسنادسازی) کا حصہ بھی نہیں بن سکے۔ اُن کا نام رُباعیات کی تاریخ میں درج ضرور ہے لیکن ادھورا، محض خانہ پُری کے لیے۔ ظفر عمر قدوائی اور محمد اشفاق عارف نے اپنے تحقیقی مقالوں میں رواں کی اہمیت منوانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ محمد تسیم خاں اور سلیمان اطہر جاوید نے بھی اس جانب توجہ دی ہے لیکن اب بھی بہت سی باتیں تشنہ ہیں۔ ایک تو اچانک کم عمری میں انتقال، دوسرے اصل مسودہ تک بآسانی رسائی نہ ہونا بھی اُن کے کلام کی اشاعت میں حائل رہا۔ تاہم اشفاق عارف نے باقیاتِ رواں کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی ہے اور تقابلی مطالعہ کے ذریعہ ضعف اور ضغطہ کی نشاندہی کی ہے۔

رواں نے جس عہد میں شاعری شروع کی، اس زمانے میں افادی، اصلاحی اور رومانی

تحریکوں کا زور تھا تاہم وہ ان سب کے عمومی رویوں سے گریزاں رہے اور ان شعرا سے بھی دُور رہے جن کا مطمح نظر محض لسانی تجربہ ہوتا تھا۔ انھوں نے نہ تو اردو کی شعری روایت کی تقلید کی اور نہ ہی اپنے دور کے غالب اسالیب سے مرعوب ہوئے بلکہ فطرتِ انسانی کے بلیغ تجربات، حسین لمحات اور قلبی واردات میں ہی انفرادی شعری رویے کی تلاش میں کوشاں رہے جس کی منفرد مثال ''روحِ رواں'' ہے۔ انھوں نے احساس و جذبات اور قلبی واردات کے تئیں شخصیت کے بکھرنے کے عمل کو اپنے اشعار میں تحلیل کرتے ہوئے چہار جانب پروان چڑھنے والے مختلف مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ وہ عہدِ غلامی کے جبر سے ہار ماننے یا مفاہمت کرنے کے بجائے اس کو ایک حقیقت سمجھ کر قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

اس نشاطِ زندگی پر ناز ہے ہم کو رواں
وقفِ تدبیرِ غلامی جس کی گھڑیاں ہو گئیں

نثر و نظم، دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والا یہ ادیب، بنیادی طور پر شاعر ہے اور ایسا شاعر جس نے محض شوکتِ الفاظ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اُس کے فن پاروں میں معنویت کا دریا بھی موجزن ہے۔ عزیز لکھنوی نے اپنے طویل مقدمہ میں رواں کے کلام میں درج ذیل نکات کی نشاندہی کی ہے۔

1۔ ان کے یہاں جذبات کی فراوانی اور جوش و خروش ہے۔
2۔ سائنس، فلسفہ و الٰہیات کے دقیق مسائل کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرنے کا ہُنر آتا ہے۔
3۔ اندازِ بیان میں نُدرت، تازگی، سلاست اور روانی ہے۔
4۔ تخئیل فلک پیا مگر اشعار اغلاط سے پاک ہیں۔
5۔ درد و تاثیر کی لہروں کے ساتھ احساسِ قومیت اور اخلاقیات کا بھرپور درس ہے۔

جدید تعلیم و تربیت کے پیش نظر رواں نے علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کے بیشتر مضامین اپنے اشعار میں نظم کیے ہیں، اُس طرح نہیں جیسے کوئی فلسفی یا سائنس داں مسائلِ حکمیہ بیان کرتا ہے

بلکہ دقیق اور خشک موضوعات شاعر کی شیریں زبان میں فطری طور پر ڈھل گئے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست کو سلیقے اور جدید طریقے سے پرونے کی بنا پر رنگینی واثر آفرینی ان کے اشعار میں رچی بسی ہے۔ خود کہتے ہیں۔

جو زمانے کے خیالات ہیں کرتا ہوں ادا
جانیے آپ مرے دَور کی تصویر مجھے

اور یہ تصویر بھی ایسی کہ۔

ازل سے آئینہ بردار ہے دلِ شاعر نہاں ہے شعر میں تاریخ ہر زمانے کی

رواں کی نظموں، غزلوں اور رُباعیات میں ہی نہیں، قطعات میں بھی شوکتِ الفاظ، تشبیہات واستعارات اور صنائع بدائع کا برمحل استعمال ہے، وہ بھی ایسا کہ جدّت ادائیگی اور نُدرتِ فکر کے ساتھ معنویت اور تاثیر بھی مجروح نہیں ہوتی ہے۔ اُن ہی کی زبانی سُنیے۔

مرے جذبات کی نُدرت ہے قائم حسنِ لفظی پر
نہیں ہے اس لیے کچھ فکرِ اندازِ بیاں مجھ کو

اُن کے اندازِ فکر اور شعر کہنے کے طریقے پر نیاز فتح پوری اور ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے کہ حسن و عشق کا بیان ہو، فطرت کی عکاسی یا جذبات کی فراوانی کا معاملہ، جگت موہن لال رواں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی رقم طراز ہیں:

''رواں کے شعر کہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی طرح غزل کہنے سے قبل تین چار روز تک اپنی طبیعت کو شاعرانہ خیالات سے مانوس کرتے ہیں۔ کسی فلسفہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں یا کوئی فارسی دیوان دیکھتے ہیں۔ جب مادہ میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور جذبات متحرک ہو جاتے ہیں اُس وقت فکر کرتے ہیں۔ دو تین گھنٹے میں غزل تیار ہو جاتی ہے۔ زبردستی طبیعت کو شعر کی طرف متوجہ نہیں کرتے۔'' (روحِ رواں، ص، 14)

ایسے قد آور فن کار کے فن پاروں سے چشم پوشی مناسب نہیں جبکہ اردو دنیا میں ہر روز یادگاری جلسے ہوتے ہیں۔ اعزازات وانعامات ملتے ہیں، یادگاری مجلے نکلتے ہیں لیکن ان کے نہیں جو حرص و ہوس اور شہرت سے دُور، ادب کے دامن میں رنگا رنگ گل بوٹے ٹانکتے رہے ہیں، زبان و ادب اور تہذیب وثقافت کی بے لوث خدمت کرتے رہے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے نہایت فعال اور لائق صد تحسین قدم اُٹھاتے ہوئے بزرگوں کی خدمات کو آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر لانے کا جتن کیا ہے۔ اس کے لیے کونسل کے تمام اراکین خصوصاً ڈائرکٹر پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) قابل مبارکباد ہیں۔ دراصل آج ضرورت ایسے ہی ادیبوں کے ادب پاروں کی فنّی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کی ہے جو کسی وجہ سے ادبی توجہ سے محروم رہے یا جن کا کلام اب آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ یہ عمل ایک طرح سے اُن کی بے لوث خدمات کا اعتراف کرنا ہے۔ اس مثبت قدم سے ہم محض رواں جیسے ادیبوں کی عزت ہی نہیں بڑھا رہے ہیں بلکہ خود اپنے ادب شناسی کے طرۂ دستار میں انسانیت اور شرافت کے پھول سجا رہے ہیں اور شاید یہ عمل صالح نئی نسل کو صحیح سمت کی جانب گامزن کرنے اور اردو زبان وادب کو فروغ دینے کا مناسب وسیلہ بھی ہے۔

اس نوعیت کے مونوگرافس کی اشاعتی شہرت سے گریزاں اور صلہ وستائش سے بے پروا، ان فن کاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی جو ماضی قریب میں زندہ تھے۔ ساتھ ہی جگت موہن لال رواں جیسے فن کاروں کی تعین قدر کا مرحلہ بھی آسان ہو جائے گا جو اردو تنقید کے ناخن پر قرض ہے۔

صغیر افراہیم

جگت موہن لال رواں

سلسلۂ نسب

بخشی مہی لال
زوجۂ اول
زوجۂ ثانی
چنی لال
پرکھنڈی لال
منولال
ہزاری لال
گنگا پرشاد
ست نرائن
کنھیا لال
بلدیو پرساد
کرتا کرشن
جگت موہن لال رواں
تربھون ناتھ بسمل
بھگوتی پرساد
سندر لال
پربھان شنکر
ہرگیان شنکر
راجندر شنکر
کلدیپ موہن
انوپ موہن
روپم چودھری
مدھوکر چودھری
اجیت موہن
پردیپ موہن
دلیپ موہن
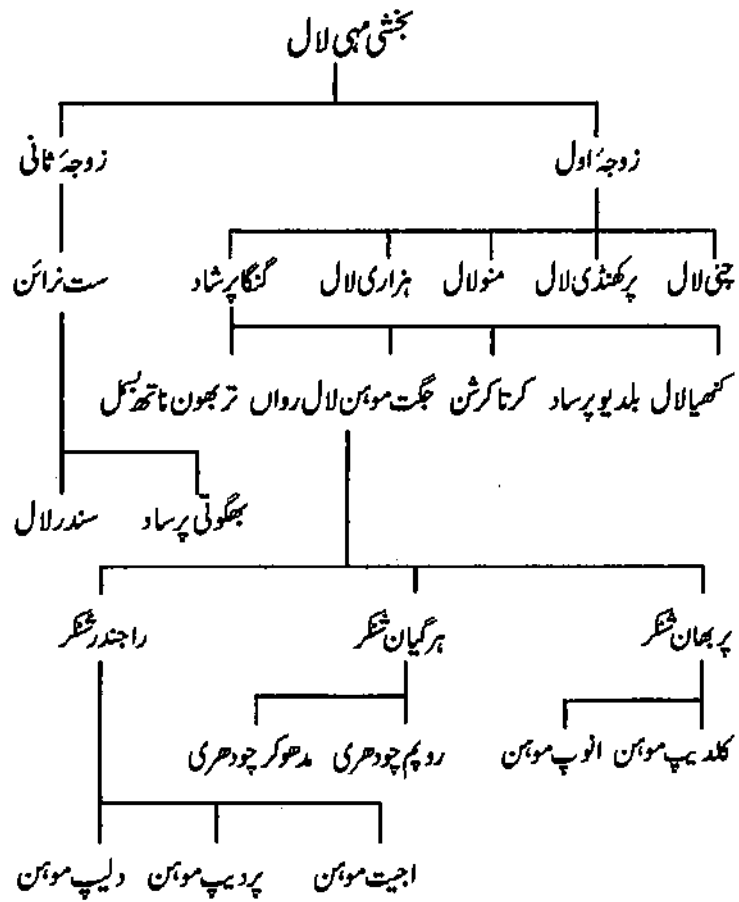
شخصیت وسوانح

اناؤ، اجودھیا کا سرحدی علاقہ اور صوبۂ اودھ کا مردم خیز خطہ رہا ہے۔ آج بھی یہ شہر اپنے دامن میں درجنوں فیکٹریوں کو سمیٹے ہوئے کاشت کے اعتبار سے نہایت زرخیز ہے۔ اس کے ایک جانب ملک کی بڑی ندی گنگا ہے تو دوسری طرف سئی ندی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں، بڑے بڑے تالاب اور جھیل نے اناؤ کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ روایت ہے کہ شری رام چندر جی بن باس جاتے ہوئے یہاں ٹھہرے تھے اور طرح طرح کے پرندوں کے اس بسیرے کو انھوں نے بہت پسند کیا تھا۔ لکھنؤ، ہردوئی، کانپور، فتح پور اور رائے بریلی کے مابین بسا ہوا یہ شہر اپنے قصبات کی وجہ سے بھی بے حد مشہور ہے۔ مثلاً گنج مراد آباد، نیوتنی، موہان، آسیون، صفی پور وغیرہ شروع سے عربی اور فارسی کا گہوارہ کہلائے ہیں تو بانگرمئو، پُروا، موراواں سنسکرت اور ہندی کا مرکز ہیں اور حسن گنج، بدرکا، ہڑہا دغیرہ انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونجتے رہے ہیں۔

تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو علم وادب کے نور سے جگمگاتا ہوا یہ شہر اپنے قصبات کی وجہ سے بھی بے حد مشہور رہا ہے۔ جیسے دریائے سئی کے کنارے، ملیح آباد، حسن گنج اور نیوتنی سے ملی ہوئی خوش گوار بستی کا نام ہے موہان، جو علم وفضل کے لحاظ سے ''موہان از خطۂ یونان'' کہلاتا ہے۔ یہاں دیکھیں تو جسٹس سید امیر علی موہانی، بیخود موہانی، افقر موہانی، بسمل موہانی، حسرت موہانی، عفت موہانی جیسے کئی نام ادبی اُفق پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح گنج مراد آباد سے ملی ہوئی صوفیوں کی بستی صفی پور ہے جہاں کے شاہ عزیز صفی پوری، اقبال صفی پوری، شہید، عارف اور

رونق صفی پوری نے بے حد شہرت حاصل کی ہے۔ نیوتنی، مسعود حسن رضوی ادیب اور آسی نیوتنی پر ناز کرتی ہے۔ صبور، سروش، یعقوب، ظفر، جلیل، اثر، چراغ محمد اور عذرا پروین جیسے درجنوں نام گنائے جا سکتے ہیں جو راقم الحروف کے آبائی وطن کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ مجاہدین آزادی کی فہرست بھی طویل ہے جن میں چندر شیکھر آزاد اور حسرت موہانی کے علاوہ رام بخش، چندریکا بخش، بھگوتی پرشاد مادھو، حبیب الرحمٰن انصاری، وشمبھر ناتھ ترپاٹھی، اوما شنکر دیکشت وغیرہ شامل ہیں۔

قومی یکجہتی کے جذبہ سے معمور شہر اناؤ ہندی جگت میں بھی اپنی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، بھگوتی چرن ورما، رام ولاس شرما، شیو منگل سنگھ سمن، جگدمبیکا پرساد دیکشت، رمئی کاکا، پرتاپ نرائن مشرا، بھوپیندر ناتھ شکلا، رائے بھوانی بخش، نندو لارے باجپئی، نصیر احمد نصیر وغیرہ چند اہم نام ہیں جن کا آبائی وطن اناؤ ہے۔ ہمارے اس شہر کے تعلق سے یہ روایت بھی مشہور ہے کہ راجا اُنونت راؤ نے اس شہر کو سجانے سنوارنے میں بڑی دلچسپی دکھلائی تھی۔ اس کا بنوایا ہوا بے حد پائیدار قلعہ سید سالار مسعود غازی کے ذریعے مسلمانوں کے تسلط میں آیا اور کچھ عرصے بعد بالائے قلعہ شاہی مسجد تعمیر ہوئی۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ صدیوں بعد اس شاہی مسجد کے صحن میں قائم مکتب 1 سے جگت موہن لال رواں کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔

سید ابو محمد ثاقب کانپوری، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، جلیل احمد قدوائی وغیرہ کے بیانات سے جگت موہن لال رواں کی شبیہ اس طرح اُبھرتی ہے —— لمبا بھرا چہرہ، روشن پیشانی، مسکراتی آنکھیں، ستواں ناک، چھوٹا دہانہ، ترشے ہوئے لبوں پر گھنی سیاہ مونچھیں جو ہمیشہ نیچے کی طرف جھکی رہتیں، کھلتی رنگت، مائل بہ دراز قد، گداز توانا جسم، سڈول بازو، چوڑا سینہ، نازک اور لمبی انگلیاں، قرینے سے بنے ہوئے انگریزی تراش کے گھنے گھونگھرالے سیاہ بال، کلین شیو۔ اُن کے ہشاش بشاش چہرے پر متانت، سنجیدگی ناز کرتی۔ خوش اخلاقی، خوش گفتاری، خوش وضعی اور خوش فکری کی جیتی جاگتی یہ مثال ''چودھری منشن'' سے باہر تو کیا، ڈرائنگ روم اور اسٹڈی روم میں بھی

گلو بند شیروانی اور چوڑی مُہری کے پائجامے میں ملبوس نظر آتی۔

جگت موہن لال رواں کے دادا بخشی مہی لال اودھ کی فوج میں منشی تھے۔ انھیں حکومت کی جانب سے چودھری کا خطاب ملا تھا۔ آبائی وطن مجریٹہ ضلع سیتا پور تھا۔ پہلی بیگم سے پانچ 2 بیٹے ہوئے۔ پانچویں بچے کی پیدائش کے دو سال بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ 1840 کے آس پاس موراواں کے کائستھ گھرانے میں اُن کی دوسری شادی ہوئی۔ زوجۂ ثانی کے بطن سے صرف ایک بیٹا3 ست نرائن پیدا ہوا۔ 1856 میں نواب واجد علی شاہ کے مٹیا محل (کلکتہ) چلے جانے کے بعد وہ اپنی سسرال قصبہ موراواں منتقل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر ظفر عمر اپنے تحقیقی مقالے ''جگت موہن لال رواں: حیات وادبی خدمات'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس گھرانے کے ایک بزرگ بخشی مہی لال جو رواں کے جد امجد تھے، شاہانِ اودھ کی فوج میں بعہدۂ منشی فائز تھے۔ یہ بے حد ایماندار اور محنتی شخص تھے چنانچہ ان کی دیانت اور نمایاں کارکردگی کے صلے میں انھیں چودھری کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ یہ زمانہ ان کی بڑی خوشحالی کا تھا لیکن غدر 1857 کے بعد بخشی مہی لال کو ان کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا، اور ہر طرح کی داروگیر شروع ہوئی۔ ان کی ساری دولت اور ثروت چھن گئی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ مجبوراً بخشی مہی لال ترکِ وطن کر کے اپنی سسرال قصبہ مورانواں ضلع اناؤ چلے آئے۔''

(ص،15)

بخشی مہی لال کے سبھی چھ بیٹے بے حد ذہین اور ملنسار تھے تاہم چودھری گنگا پرساد کو پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ انٹرنس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد چودھری گنگا پرساد اناؤ عدالت میں مختاری کرنے لگے۔ ان کی شادی قصبہ جائس ضلع رائے بریلی کے کائستھ گھرانے میں ہوئی۔ عدالت کی بے پناہ مصروفیات کی بنا پر صدر بازار میں، اپنی آبائی زمین پر رہائش اختیار کر لی۔ ان

کے پانچ بیٹے، کنہیالال، بلدیو پرشاد، کرتا کرشن، جگت موہن اور تربھون ناتھ تھے۔ اتفاق کہ ان کے پانچوں بیٹے، باپ کی طرح ادبی ذوق کے مالک، نیک، محنتی اور تعلیم یافتہ تھے۔

چوتھا بیٹا (جگت موہن لال) بروز دوشنبہ 14 جنوری 1889 مطابق 11 جمادی الاولیٰ 1306ھ کو پیدا ہوا۔ پانچ سال پورے ہونے پر چودھری گنگا پرساد نے اپنے گول مٹول بیٹے کو جسے وہ پیار میں 'گولو' کے نام سے پکارتے تھے، اور جو ادبی حلقے میں رواں کے نام سے مشہور ہوا، باقاعدہ مکتب میں داخل کراتے ہوئے ایک شاندار تقریب منائی جس میں مولوی ضیاء الدین بھی شریک ہوئے۔ گول مٹول اور چنچل رواں، گھر میں جگت کہلاتے تھے۔ ابھی وہ نو سال کے ہی تھے کہ والد چودھری گنگا پرشاد (1898) کا انتقال ہو گیا۔ رواں پر اس کا اس لیے بھی بہت اثر ہوا کہ والد کے انتقال کے بعد والدہ علیل رہنے لگیں۔ تمام ذمہ داری بڑے بھائی چودھری کنہیالال پر آ گئی۔ 'جگت' کا بیشتر وقت دوستوں کے ساتھ گزرتا۔ قرب و جوار کے ماحول اور گھر کی فضا نے انھیں شروع سے ہی موزوں طبع بنا دیا تھا۔ محمد نسیم خاں (مرتب ''باقیاتِ رواں'') مختلف حوالوں سے لکھتے ہیں کہ رواں نے تقریباً چھ سات سال کی عمر میں اُس وقت پہلا شعر کہا جب وہ لڑکوں کے ساتھ کپڑے کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ شاٹ لگانے پر کپڑے کا وہ گیند پھٹ گیا اور اُس کے چیتھڑے باہر نکل آئے۔ رواں نے یہ دیکھ کر برجستہ کہا۔

ذرا گیند میرا اُٹھا لائیے
پھٹے چیتھڑے مجھ کو دکھلائیے

یہ شعر آئینہ دار ہے کہ اُس عمر سے ہی رواں کے مزاج میں تجسس اور غور و فکر کا جذبہ موجود تھا۔ چیتھڑے دیکھنے کا خیال اس امر کا عکاس ہے کہ گیند کیوں پھٹا؟ کیا سلائی کمزور تھی؟ یا کپڑا سڑا ہوا تھا یا بیٹ کی چوٹ کی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ پھٹ گیا۔ غور و فکر کا انداز عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ عزیز لکھنوی ''روحِ رواں'' کے مقدمہ میں اُن کے بچپن کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے ادبی ذوق و شوق کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رواں بچوں سے موزوں الفاظ میں گفتگو کرتے تھے۔ خاندان کے بزرگوں کے لیے ان کی موزوں طبعی ایک مشغلہ تھا۔ اکثر فرمائشیں ہوتی تھیں کہ دیکھو یہ چڑیا دیوار پر بیٹھی ہے، اس پر ایک شعر تو کہو۔ یہ دو تین منٹ کے بعد ایک شعر نظم کر کے سناتے تھے اور خراج تحسین وصول کرتے تھے۔'' (ص،12)

بچپن میں ان کے کھیل کود اور ادبی مشاغل کے دو مرکز تھے۔ صدر بازار میں واقع ان کا گھر یا پھر محلّہ قلعہ، قیصر گنج، کیتھیانہ اور چودھرانہ۔ ان کا گھر بے حد مصروف علاقہ، کانپور، لکھنؤ روڈ پر تھا۔ سامنے کے حصہ میں فاصلے پر زنانہ و مردانہ اسپتال، پھر ریلوے کراسنگ کے بعد سول لائن۔ روڈ کراس کرنا سخت منع تھا۔ اس لیے وہ بدھواری یا شیخواڑہ ہوتے ہوئے قلعہ پر آتے، جہاں واقع مکتب میں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔ ملا ہوا بڑا علاقہ کایستھوں کا تھا جو عرف عام میں کیتھیانہ کہلاتا تھا، اور جہاں ان کے کئی عزیز رہتے تھے۔ کیتھیانے سے ملحق محلّہ چودھرانہ تھا۔ یہ اناؤ کے سب سے بڑے رئیس و تعلقہ دار کی بستی تھی۔ چودھری محمد ماہ صاحب اور سید ابوالقاسم زیدی کے خاندان سے ان کے مراسم تھے۔ جگت (رواں) کے تمام دوست شہر کے اسی حصہ میں رہتے تھے اس لیے ان کا دل اس جانب بہت لگتا تھا۔ گرمیوں کی سخت دھوپ میں بھی وہ گلیوں سے ہوتے ہوئے محلّہ قلعہ آجاتے۔ اس وقت قلعہ کے تقریباً تمام نقوش مٹ چکے تھے، محض چند بُرجیاں برقرار تھیں۔ اتفاق یہ کہ باقی بچی ہوئی بُرجیاں صدر بازار، بدھواری اور شیخواڑہ کو جوڑنے والی راہ پر تھیں۔ قلعہ کا اوپری حصہ ایک بہت بڑے میدان کی شکل میں تھا جس میں ہفتہ میں تین دن (بدھ، جمعہ، اتوار) بازار لگتا تھا۔ میدان کے دونوں سروں پر ایک ایک بڑی بلڈنگ چھوٹے بڑے جانوروں کے گوشت کے لیے تھی جو انگریز حکومت کی طرف سے بنوائی گئی تھی اور جس کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، بازار کے بعد یہ کھیل کا سب سے محفوظ اور بچوں کا پسندیدہ مقام تھا۔

علاج کی غرض سے والدہ موراواں گئیں لہٰذا رواں بھی وہیں آ گئے اور کیدار ناتھ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا گیا۔ ابھی داخلے کے چند ماہ بھی مکمل نہیں ہوئے تھے کہ والدہ یشودا کا مارچ 1906 میں انتقال ہو گیا۔ عزیزوں کی شفقت اور بھائی کی سرپرستی میں انھوں نے 1907 میں کیدار ناتھ ڈائمنڈ جوبلی سے فرسٹ ڈویژن میں ہائی اسکول پاس کیا۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ کرا دیا گیا۔ وہاں سے انھوں نے انٹر کیا۔ کالج کے پرنسپل نے ان کی ذہانت، لگن اور یکسوئی کو دیکھتے ہوئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ لالہ سری رام ''خم خانۂ جاوید'' جلد سوم میں لکھتے ہیں:

> ''اپنی خداداد صلاحیت، ذہانت، شوق، علم اور محنت کی بدولت رواں نے 1909 میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی درجہ اول میں پاس کیا جس کے صلے میں انھیں کالج کی طرف سے نقرئی تمغے کے اعزاز کے ساتھ آئندہ تعلیم کے لیے وظیفہ علمی بھی مل گیا۔'' (ص، 536)

1911 میں انگریزی، فارسی اور فلسفہ کے ساتھ بی۔ اے۔ اور 1913 میں اسی کالج (کیننگ کالج) سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ کیا۔ 1916 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ سبھی امتحان انھوں نے امتیازی حیثیت سے پاس کیے اور اناؤ واپس آ کر وکالت شروع کر دی۔

رواں اناؤ میں فوجداری کے معروف وکیل رائے بہادر چودھری جگناتھ پرشاد، ایم ایل سی کے شاگرد ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فوجداری کے معروف وکیل بن گئے۔ جلیل قدوائی صاحب ''تذکرے اور تبصرے'' میں لکھتے ہیں:

> ''بحیثیت فوجداری کے ایک وکیل کے رواں اناؤ میں چوٹی پر تھے۔ ان کی قانونی قابلیت کے متعلق میں ایک ماہر کی حیثیت سے رائے نہیں دے سکتا، اس لیے کہ میری اپنی قابلیت اس حد تک مشتبہ ہے کہ کئی سال کی متواتر کوشش کے باوجود وکیل نہ ہو سکا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اناؤ بار ایسوسی

ایشن کے تمام وکلا حتیٰ کہ خود ان کے استاد فوجداری وکلا کے میر لشکر رائے بہادر چودھری جگناتھ پرساد سابق ایم ایل سی بھی ان کی قابلیت کے معترف ومداح تھے۔" (ص)

رواں فوجداری کے کامیاب وکیلوں میں تھے مگر ان کو اس پیشے سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ وہ مکر وفریب اور جوڑ توڑ کی فضا سے اکتاہٹ کا اظہار اکثر اشعار میں کرتے ہیں بلکہ ایک پورا ڈرامہ بھی اس صورت حال پر قلم بند کرتے ہیں۔ کچہری کے ماحول سے پناہ مانگتے ہوئے اپنے دلی جذبات اور کیفیات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

اس پہ طرّہ مجھ سے قسمت کا عناد ـــ شعر گوئی اور وکالت میں تضاد
گو کہ دل ہے طائرِ بے دسترس ـــ اک جراحت خوردۂ تیرِ ہوس
نفس کی تبدیلیوں کو کیا کروں ـــ ان قفس کی تیلیوں کو کیا کروں
بے تکلف کہہ رہا ہوں صاف صاف ـــ ہے وکالت میری فطرت کے خلاف
اس جہادِ زندگی سے الاماں ـــ الاماں اس بے کسی سے الاماں
بات کرنے کا نہ ہو جن کو شعور ـــ میں کہوں وہ دو پہر ان کو "حضور"
لکھ نہیں سکتے جو پورا اپنا نام ـــ روز کرتا ہوں انھیں جھک کر سلام
میں پجاری روح کا بھی تن کا بھی ـــ ہو نہ یارب حال یہ دشمن کا بھی

قانون میں مہارت حاصل کرنے سے پہلے جگت موہن لال رواں جب ایم۔اے کر رہے تھے، بھائیوں کے مشورے سے حیدر آباد کے ایک ممتاز گھرانے میں رشتہ طے ہوتا ہے اور جلد ہی راج کماری دیوی سے شادی ہو جاتی ہے[5]۔ تین بیٹے پربھان شنکر، ہرگیان شنکر اور راجیندر شنکر ہوئے۔ رواں کے انتقال کے وقت راجندر شنکر بارہ برس کے تھے۔ رواں اپنے تینوں بیٹوں کو بہت چاہتے تھے تاہم پربھان شنکر (1917-1988) اپنے بھولے پن، ذہانت اور شعر فہمی کی وجہ سے انھیں بے حد عزیز تھے۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ شعر سنتے ہی ذہن میں خود اپنی جگہ بنا لیتا تھا۔ بعد میں

سروش تخلص اختیار کیا اور ادبی حلقے میں بے حد مشہور ہوئے۔ چودھری پر بھان شنکر سروش نے لکھا ہے کہ والد محترم، والدہ (راج کماری دیوی) کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب وہ مثنوی لکھ رہے تھے تو اس کے تمام اشعار وہ "ممی" کو سناتے جاتے تھے بلکہ اکثر ان سے مشورے بھی لیتے تھے۔ والد کے انتقال کے 27 سال بعد 1961 میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا آخر تک معمول رہا کہ وہ بھگوت گیتا کے بعد پابندی سے "نقدِ رواں" کا بھی پاٹھ کرتی تھیں۔

جگت موہن لال رواں اپنے ہم عصر شعرا میں اصغر، حسرت اور عزیز کا کلام دل سے پسند کرتے تھے۔ جگر مراد آبادی، ثاقب کانپوری، پریم چند، ممتاز احمد قدوائی اور جلیل احمد قدوائی سے ان کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ جگر کے ساتھ ایک شب کی صحبت کا ذکر وہ ایک رباعی میں اس طرح کرتے ہیں۔

فطرت کی ہما ہمی نہ بھولے گی ہمیں
نکھری ہوئی چاندنی نہ بھولے گی ہمیں
جب ہم تھے جگر تھے اور بزمِ بادہ
وہ رات رواں کبھی نہ بھولے گی ہمیں

ظفر عمر قدوائی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں رحم علی ہاشمی کے حوالے سے عزیز لکھنوی کے شاگردوں کے نام اس طرح گنائے ہیں۔

1۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی
2۔ حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی
3۔ محمد یٰسین تسکین سورانوی
4۔ شیام موہن لال جگر بریلوی
5۔ شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی
6۔ عبدالرشید، رشید لکھنوی

7۔ جگت موہن لال رواں اناوی
8۔ شیفتہ لکھنوی
9۔ کیفی لکھنوی

رواں کے فطری لگاؤ اور رکھ رکھاؤ نے انھیں استاد کے بے حد قریب کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ان کے عزیز شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ مرزا جعفر حسین اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی اپنے شاگردوں میں رواں کو بہت یاد کیا کرتے تھے------- شاگردوں کا ذکر آجاتا تھا تو رواں کے بارے میں کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور ہو جاتا تھا۔ حقیقت امر بھی یہ ہے کہ رواں کے کلام میں عزیز مرحوم کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔'' (بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں'(ص،153)

شاعری کے آداب سکھانے کے ساتھ ساتھ استاد محترم نے انھیں شعر کی اہمیت اور افادیت سے بھی روشناس کرایا۔ 3 فروری 1928 کو 'روحِ رواں' کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

''شعریت محض ایک جوہر فطری ہے جس کو تعلیم واکتساب سے کوئی علاقہ نہیں مگر قوتِ گویائی کا انحصار مشق پر ہے۔ اُسی کے ساتھ ساتھ تکمیلِ فن کے لیے مطالعہ واصلاح بھی اک ناگزیر کوشش ہے۔ دانہ سے درخت کا نکلنا اور اُس کی طاقت نشو ونما میں گل وریحاں کا مضمر ہونا ایک قدرتی کرشمہ ہے لیکن آبیاری اور نگہداشت کے بغیر درخت میں وہ حُسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ آج کل خود روشعرا کی وہ جماعت جس نے مغربی چشموں سے اپنی پیاس بجھائی ہے، فن اور اصولِ فن کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، اُن کی آزادی متقدمین کی تقلید گوارا نہیں کرتی۔ مغربی علوم حاصل کرنے کے بعد شعر کا میدان بھی ان کے نزدیک اُتنا ہی فراخ ہے

جتنا فٹ بال بابا کی کا۔۔۔۔۔ مصنف روح رواں آج کل کے خود رو شعرا
کی طرح اپنے کلام کو عیوب سے پاک نہیں سمجھتے اور اس فن کو مستقل فن
جانتے ہیں۔اس پختہ خیالی نے ان کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ کبھی کبھی کسی
سے مشورہ سخن بھی کیا کریں چنانچہ 1906 سے انھوں نے مجھے اپنے حلقۂ
احباب میں داخل کیا۔ان کے صفات و اخلاق سے مجھے بھی اُن کے ساتھ
ایک خاص محبت ہوگئی۔اب تک کبھی کبھی وہ مجھ سے مشورہ کر لیتے ہیں مگر
درحقیقت وہ کائنات کی شعریت کو فطرت انسانی کی رفعتوں سے دیکھتے
ہیں اور ان کا مطمح نظر عام سطح سے بہت بلند ہے۔" (ص،14-13)

وکالت شروع کرنے کے بعد جگت موہن لال رواں کی مصروفیت بڑھتی گئی پھر بھی وہ پابندی سے قلعہ بازار کے علاقے میں آتے تھے۔ پہلا سبب سینئر ترین وکیل کرامت حسین صاحب سے ملنے۔دوسرا سبب حکیم ولایت علی نقوی اور ڈاکٹر افراہیم شاہ سے طبی مشورہ لینے کے لیے، تیسرا سبب ''آفتاب پریس'' پر بیٹھ کر کچھ دیر احباب سے گفتگو کرنا، اور چوتھی وجہ قیصر گنج بازار سے تمبا کو اور قوام حاصل کرنا جس کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا۔

رواں ہمیشہ چاق و چوبند اور صحت مند نظر آتے۔تاہم پیٹ کی تکلیف میں مبتلا رہنے کی بنا پر کبھی کبھی نہ صرف خود گم صُم ہو جاتے بلکہ احباب بھی اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا محسوس کرتے۔ جانِ محفل جگت موہن لال رواں میں ایک کامیاب قصہ گو کی تمام صفات موجود تھیں۔محفلوں میں اپنی گُل افشانی کی بدولت ہمیشہ چھائے رہتے۔احباب کہتے کہ آپ داستان گو ہیں، شاعر ہیں، قانون داں ہیں یا ماہر شکاریات۔رواں جواب دیتے، میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوں مگر یہ کم بخت ریاحی تکلیف جان لیوا ثابت ہوگی۔ایسے میں انھیں مرغن غذاؤں سے پرہیز کی ہدایات کی جاتیں مگر اگلے ہی دن دعوت میں تمام ہدایات فراموش ہو جاتیں۔جلیل قدوائی 6 ''تذکرے اور تبصرے'' میں لکھتے ہیں:

''انھیں کچھ ریاحی تکلیف رہتی تھی جس کے سبب کبھی کبھی یکا یک انھیں چکر آجا تا تھا اور وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ان کے احباب خائف رہتے کہ کسی دن یہ مرض رنگ نہ لائے۔ میں نے سنا تھا کہ پچھلے دنوں کچہری سے واپسی پر انھیں راستہ میں اس مرض کا ایک شدید حملہ ہوا تھا، اس لیے میں نے اس کے متعلق استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شدت تو نہیں مگر مرض باقی ہے---- افسوس کیا خبر تھی کہ یہ دلچسپ ملاقاتیں، آخری ملاقاتیں اور یہ پُر لطف صحبتیں آخری صحبتیں ثابت ہوں گی، اور صرف ان کی یاد سوہان روح کے لیے باقی رہ جائے گی۔'' (ص،118)

رواں بے حد وضع دار انسان تھے۔ حقہ اور سگریٹ کے علاوہ شکار کا بے حد شوق تھا۔ شکار کا باقاعدہ منصوبہ بنتا۔ اگر لکھنؤ کی طرف جانا ہوتا تو، نواب گنج جھیل مرکزی محور ہوتا، اور پھر وہاں سے ان کی موٹر آسیون کی طرف مُڑ جاتی۔ اگر اس کے برعکس کانپور کی طرف جانا ہوتا تو مگر وارہ کے قرب و جوار میں شکار کے بعد گھر واپس آجاتے اور اگر شکلا گنج تک پہنچ جاتے تو پھر گنگا پار کر کے بھائی کے یہاں قیام کرتے۔ بقول ثاقب کانپوری ''شکار کی دعوت'' پر ان کا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ جلیل قدوائی ''تذکرے اور تبصرے'' میں لکھتے ہیں:

''22 ستمبر 1934 کو شب کو دس بجے، یعنی مرنے سے چار دن پہلے، میں اور رواں اس مسئلہ پر جھگڑ رہے تھے، کہ دوسرے دن علی الصباح شکار پر چلا جائے۔ چونکہ میں دوسرے دن لکھنؤ پہنچنے کے لیے اپنے ایک عزیز کو لکھ چکا تھا اور اس سے جھوٹا نہ ہونا چاہتا تھا اس لیے شکار کا پروگرام ملتوی کرنا چاہتا تھا۔ مگر رواں دوسروں کو بھی دعوت دے چکے تھے اور مُصر تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ شکار پر جاؤں۔ بہر حال مسئلہ یوں طے ہوا کہ رواں شکار پر جائیں، میں لکھنؤ جاؤں مگر شام کو ہم دونوں اناؤ واپس

آجائیں اور شکار ساتھ کھائیں۔ افسوس میں اس وعدہ پر قائم نہ رہ سکا۔
لکھنؤ میں میرے عزیز نے نہ صرف مجھے انتہائی اصرار کے ساتھ روک لیا
بلکہ میرے بیوی بچوں کو بھی اناؤ سے بلوالیا اس لیے اور بھی کہ میں
''تعطیلاتِ خزاں'' میں صرف چند دن کے لیے علی گڑھ سے وطن گیا تھا اور
کچھ نہیں معلوم تھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی۔ بڑی مشکل سے 26 ستمبر کو
بعد دو پہر مجھے واپسی کی اجازت ملی۔ اناؤ واپس پہنچ کر موٹر سے اترتے ہی
پہلی خبر جو کانوں نے سنی یہ تھی کہ رواں اس دنیا میں نہیں ہیں.........''

(ص،113)

ظفر عمر قدوائی جب اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے اُس وقت چودھری پربھان شنکر سروش نے
اپنے والد کے حالات تفصیل سے انھیں قلم بند کرائے تھے:

''اتوار 23 ستمبر 1934 کو رواں شام کے وقت شکار سے گھر واپس
ہوئے تو بخار اور سر میں درد تھا۔ خاموشی سے لیٹ رہے۔ صبح بخار شدت
اختیار کر چکا تھا۔ ان کے محرر منشی محی الدین حسب معمول کچہری جانے
سے قبل ان کے پاس آئے تو انھیں بیمار پایا۔ رواں نے ان سے کچہری نہ
جاسکنے کی معذرت ظاہر کی۔ سروش صاحب اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ
کے طالب علم تھے۔ کانپور میں پڑھتے اور وہیں رہتے تھے۔ 25 ستمبر 34
عیسوی کو وہ اطلاع پاکر اناؤ آئے۔ یہاں ڈاکٹر شیو ادھار سنگھ سول سرجن
اناؤ رواں کا علاج کر رہے تھے۔ انھیں کا علاج تا وقت مرگ ہوتا رہا۔ اس
علاج سے رواں کو کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''
اس علاج کے علاوہ تربھون ناتھ نے کانپور کے مشہور وید پنڈت رامیشور
اور پنڈت چندر شیکھر سے بھی رجوع کیا مگر وہ نہ مل سکے۔ ڈاکٹر بنواری

لال ہومیو پیتھ اناؤ نے اس وقت دیکھا جب رواں کا آخری وقت تھا۔اس
لیے انھوں نے بھی کوئی دوا نہ دی۔ بدھ کے دن علی الصباح تر بھون ناتھ
حکیم کنھیا لال مالک چاند اوشدھالیہ اے بی روڈ کانپور کو لینے روانہ
ہوئے۔ واپسی میں ابھی وہ مگروارہ یعنی اناؤ سے چار میل دور تھے کہ خبر ملی
رواں فوت ہو چکے ہیں۔'' (ص،59)

آخر کار اناؤ کی ادبی محفلوں کی یہ جان، ممتاز شاعر و ادیب اور مانا ہوا وکیل اپنی عمر کے پینتالیس سال آٹھ مہینے بارہ دن پورے کر کے 26 ستمبر 1934 عیسوی، مطابق 16 جمادی الآخر 1353ھ، بروز چہارشنبہ (بدھ) ٹھیک 11 بجے دن میں ابدی سکون کی تلاش میں موت کی آغوش میں سو گیا۔(موت کی آغوش میں شاید سکونِ دل ملے (رواں)

دیا نرائن نگم، ایڈیٹر ماہ نامہ 'زمانہ' نے ان الفاظ میں اظہارِ غم کیا تھا:

'' آخری ہفتہ ستمبر میں چودھری جگت موہن لال رواں کی اچانک موت
اردو ادب کے لیے ایک دردناک سانحہ ہے۔ان کی وفات سے ''زمانہ''
کی بزمِ سخن سونی ہو گئی ہے، اور دنیائے شاعری میں آج ہم کو سناٹا سا
محسوس ہو رہا ہے۔اردو ادب کو اس سانحہ سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی
تفصیل مشکل ہے اور تلافی تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اہلِ خاندان اور
عزیزوں کو آج دنیا تاریک نظر آ رہی ہے۔مگر انسان ایسی مصیبتوں میں
سوائے آنسو بہانے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔خداوند تعالیٰ آپ کی روح
پر فتوح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا
فرمائے۔'' (اکتوبر 1934، ص،257)

جناب اقبال ورما سحر ہتگامی نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

اے رواں افسوس ہے کہ آج تو مرحوم ہے
صفحۂ آفاق تیرے نقش سے محروم ہے
یا خدا یہ کیسی اپنی شومیٔ مقسوم ہے
کل جو تھا موجود ہم میں آج وہ معدوم ہے
تیرے ہی ہاتھوں بنے جب زندگی اے کردگار
تو وہی پھر کیوں ہو آخر اس قدر ناپائیدار
اس قدر ناپائیدار اور اس قدر بے اعتبار
زندگی کا جیسے ہستی میں نہ ہو کوئی شمار
جیسے ہو خود نیستی کی اک نمود بیقرار
یا عدم کی کوئی جیسے چلتی پھرتی یادگار
جیوں کسی شے کا ہو پانا اور کھونا ایک سا
ہو کسی حالت کا جیوں ہونا نہ ہونا ایک سا
ایسے ہی جذبات سے ہم اے رواں مجبور ہیں
ہاں طلسم رنگ و بو سے سر بسر مسحور ہیں
کیوں نہ پھر روئیں کہ ہم بے بس ہیں بے مقدور ہیں
اس پہ گریاں ہیں کہ واماندہ ہیں اور مجبور ہیں
تیری خوش روئی، خوش آہنگی جو تھی جان مراد
کتنی جاں افزا ہے اپنے واسطے اب ان کی یاد
ان کی یاد اور یاد تیرے اس عظیم احسان کی
تو نے نظم و نثر اردو پر کیا جو واقعی
تازگی کی رو تری تخئیل فطرت میں جو تھی
تو نے دی علم و ادب کو ایک نئی سی زندگی

زندگی وہ جس میں تیری زندگی مستور ہے
موت یوں تو مرنے والے تجھ سے کوسوں دور ہے
دلکشی کا ایک نمونہ تیری اک تحریر ہے
جو مرقع ہے سراپا عالمِ تصویر ہے
ہر رُباعی دل کے احساسات کی تصویر ہے
شاعرانہ خواب کی بگڑی بنی تعبیر ہے
گتھیاں ارض و سما کی کھوجتا جاتا ہے تو
کچھ تو سلجھاتا ہے تو اور کچھ کو الجھاتا ہے تو

(ماہنامہ'زمانہ' کانپور، دسمبر 1934، ص، 284)

رواں دوستوں کے دوست تھے۔ ان کے حلقۂ ارباب میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ سروش اناوی کے مطابق لکھنؤ میں طالب علمی کے زمانے کے دوستوں کی فہرست یوں تقسیم ہوتی تھی کہ یہ حضرت گنج، امین آباد، نخاس وغیرہ کی سیر پر شریک رہنے والے، یہ گومتی کے کنارے ٹہلنے والے، یہ تھیٹر وغیرہ میں شرکت کرنے والے، اور یہ دوست ریڈنگ روم اور کتب خانے والے۔ اناؤ میں بھی انھوں نے کچھ اسی طرح کی محفلیں سجا رکھی تھیں۔ یہ محض کورٹ کچہری والے، یہ خوش گپیوں والے، سننے سنانے والے، سیر و سیاحت کا دم بھرنے والے، شکاری جال پھیلانے والے.....لیکن کچھ ایسے بھی دوست تھے جو محفلوں کی جان تھے۔ نیاز فتح پوری، ثاقب کانپوری، اشتیاق عارف ہسوی اور جلیل قدوائی نے کئی محفل کے مناظر قلم بند کیے ہیں۔ آخری لمحات کی کہانی ''تذکرے اور تبصرے'' کے عنوان سے اس طرح بیان کی گئی ہے:

''رات کو نکھری ہوئی چاندنی میں اپنے عالی شان مکان کی اوپری منزل کی چھت پر صبح کے دو بجے تک اپنی زیر تالیف مثنوی ''گوتم بدھ'' کے اشعار کہتے رہے، پھر وہیں شبنم میں سو گئے۔ صبح اُٹھے تو کسل تھا اور حرارت بھی

تھی۔ اسی حالت میں نہائے۔ اتوار کا دن تھا۔ اس لیے آرام کیا مگر بخار
چڑھ آیا جس کا معمولی علاج ہوا۔ دوسرے دن بخار ہی کی حالت میں
اپنے مقدمات کی پیروی کی۔ تین بجے عدالت سے واپس ہوئے تو
حالت بہت خراب ہوگئی۔ اسی رات سرسام ہوگیا۔ کسی کو پہچانتے نہ تھے۔
تیسرے دن صبح آٹھ بجے زبان بند ہوگئی۔ گیارہ بجے دن کو سخت اضطراب
کی حالت میں دم توڑا..... ہر طرف کہرام مچا تھا اور در و دیوار سے آہ و بکا کی
صدا آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دستِ قضا نے اپنے فولادی ہاتھوں
سے سارے شہر کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔'' (ص،114-115)

یادوں کے دریچوں سے باہر آ کر دیکھیں تو ایک مخصوص تابناک اور موثر منظر صفحۂ قرطاس پر ملتا
ہے، اس کا بیان مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی جو اناؤ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، یوں کرتے ہیں:

''سابقہ دیرینہ مراسم کے علاوہ 1925 سے لے کر 1929 تک میرا
قیام بسلسلۂ ملازمت رہا اور یکجائی کا موقع ملا۔ اکثر ملاقات ہوتی رہتی
تھی۔ یہ صحبتیں صرف ادبی مباحث اور شعر و شاعری تک محدود رہتی تھیں
اور ان کی یاد اب تک تازہ ہے۔ رواںؔ بے حد خلیق اور متواضع تھے مگر اسی
کے ساتھ انتہا کے غیور اور خوددار بھی تھے۔ ان کی دوستی کا معیار انسانیت
تھی نہ کہ مذہب۔ اپنے احباب کے انتخاب میں وہ مذہب کو پسِ پشت
ڈال دیتے تھے۔''

مثنوی 'نقدِ رواں' کے مقدمہ میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''رواںؔ وکیل تھے اور میں ایک عدالت کا حاکم مگر انھیں دوستانہ مراسم کا
اس قدر پاس و احترام تھا، اور ان کو قائم رکھنے میں اتنی احتیاط برتی کہ پانچ
برس کی طویل مُدّت میں مشکل سے دو چار مقدموں میں میرے سامنے

آئے ہوں گے، وہ بھی مجبوریوں کی بنا پر۔ حالانکہ ہمارا باہمی ربط وضبط
لوگوں سے پوشیدہ نہ تھا اور وہ چاہتے تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، اور جائز
طریقے سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، مگر انھوں نے یہ امر کبھی گوارا نہ کیا۔
مقدمات کی پیروی ایک طرف، انھوں نے سفارش سے بھی احتراز کیا۔
شاید یہی ایک مثال ان کے کردار کی خوبی اور علو پر روشنی ڈالنے کو کافی ہے۔"

سید ابوالخیر کشفی نے اپنے والد محترم سید شاہ ابومحمد ثاقب کے حوالے سے اُن کے علمی ذوق، ادبی شوق، محبت اور مساوات کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ خصوصاً اس جانب توجہ دلائی ہے کہ رواں کی شاعرانہ خوبیوں میں زبان کی سادگی اور اظہار کی بے ساختگی نمایاں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حرص دنیا میں گر انسان گرفتار نہ ہو
دل پشیمان نہ ہو روح کبھی خوار نہ ہو
لغزشیں یہ ہیں، عمل یہ ہے خدا ہی کی پناہ
کیا کرے روح اگر جسم سے بیزار نہ ہو
بے محل فکر طلب جذبہ ضائع ہے رواں
ہاتھ پھیلاؤ جہاں صورتِ انکار نہ ہو

رواں استعارات، تشبیہات اور تلمیحات کے ذریعے بڑے سے بڑے واقعہ کو چند اشعار میں جذب کر دینے کا ہنر جانتے تھے۔

بتوں کا ذکر کرتے ہیں خدا کی یاد کرتے ہیں
فرشتے بھی نہیں کرتے جو آدم زاد کرتے ہیں
ترے بیمار غم کا آج شاید وقت نازک ہے
کہ سارے چارہ جو بیٹھے خدا کو یاد کرتے ہیں

یہ حالت وید کے قابل ہے بیمار محبت کی
کہ اہلِ درد چُپ ہیں ، چارہ گر فریاد کرتے ہیں
شہید یاس بھی وجہ حصول مدعا بھی ہے
یہی دل عاشق کی ابتدا بھی انتہا بھی ہے
سیہ کاری پر آجاتا ہے جب انساں کا دلِ غافل
یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ کوئی دیکھتا بھی ہے

تذکرہ شعرائے اتر پردیش حصہ دوم میں عرفان عباسی نے اُن کے علمی اور ادبی ذوق کے تعلق سے لکھا ہے:

''کائستھ گھرانوں کی علم وادب سے روایتی دلچسپی، محبت اور گہرا لگاؤ انھیں ورثے میں ملا تھا۔ وہ جس دور میں پروان چڑھے اس کا سارا ماحول شعر وادب میں سرشار تھا۔ گھر گھر شعر وسخن کے چرچے تھے، درو دیوار سے نغمے پھوٹتے تھے، اسی سرمستی و سرشاری کی فضا سے متاثر ہوکر رواں صاحب بھی شاعری کی طرف مائل ہوئے اور دلی جذبات کو شاعرانہ قالب میں ڈھالنے لگے۔'' (ص،133)

شعر کہنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے مضمون، افسانے لکھتے، ترجمے کرتے۔ علم عروض پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ لکھنؤ کے نامور اور کہنہ مشق استاد شاعر عزیز لکھنوی کی شاگردی اختیار کرلی۔ عزیز لکھنوی کو رواں کی خداداد صلاحیتوں پر ناز تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کا ذکر بڑی محبت اور شفقت سے کیا کرتے تھے۔

جوش و اثر ، رواں و جگر، کیفی و نشاط
یہ گُل ہیں میرے گلشن بے خار کے لیے

رواں نے نظموں کے علاوہ ڈراموں کے بھی ترجمے کیے۔ گالزوردی کے ڈرامے Skin

game کو انھوں نے ''فریب عمل'' کے قالب میں ڈھالا جسے ادبی حلقہ میں بہت پسند کیا گیا، اور ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے اسے شائع کیا۔ خود ایک ڈرامہ ''سمجھاون بجھاون'' کے نام سے خلق کیا۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے جس میں ''انارکلی'' کا بہت چرچا رہا۔

ان کی اچانک موت پر درجنوں تحریریں منظر عام پر آئیں۔ جوش ملیح آبادی اپنے دوست کے بچھڑنے پر کہتے ہیں۔

کیا موت نے تصویر بنائی افسوس
اِک آن میں ہو گئی جدائی افسوس
ایامِ شباب اور پیامِ رخصت
اے عمر رواں یہ بے وفائی افسوس

بابو کرشن سہائے ہنکاری جن کا تخلص وحشی تھا اور جو رواں کے چھوٹے بھائی تربھون ناتھ بسمل کے ساتھ کانپور میں وکالت کرتے تھے، گنگا گھاٹ سے واپسی پر اُسی شب، نوحہ کی شکل میں دلی جذبات و احساسات کا اظہار ''بر وفات منشی جگت موہن لال رواں ایڈوکیٹ اناؤ، مصنف روحِ رواں'' عنوان کے تحت کرتے ہیں۔

کون یہ عالم کی نظروں سے نہاں ہوکر چلا — توڑ کر بندِ عناصر شکلِ جاں ہوکر چلا
منزلِ ہستی سے گردِ کارواں ہوکر چلا — عالمِ ارواح کو ''روحِ رواں'' ہوکر چلا
کون ہے وہ دہر سے جو صورتِ ارماں چلا
رو رہی ہے خلق اُس کو اور وہ خنداں چلا
آخری جامِ مئے ہستی پیے جاتا ہے کون — دوستوں کو داغِ مجبوری دیے جاتا ہے کون
بزمِ اربابِ ادب سونی کیے جاتا ہے کون — ساتھ اپنے ساغر و مینا لیے جاتا ہے کون
کون ہم سے پھر نہ ملنے کو جدا ہوتا ہے آج
کس کا ماتم ہے کہ ہر پیر و جواں روتا ہے آج

مرنے والے گر نہیں سنتا نہ سُن آہ و بکا واسطہ اپنی محبت کا مجھے اتنا بتا
تو تو بے احباب یک لحظہ بھی رہ سکتا نہ تھا چھوڑ کر ہم سب کو آخر کیسے تنہا چل دیا
کیا ہوا جو دوستوں سے اس قدر بیزار ہے
دیکھنا بھی مڑ کے تجھ کو اک نظر دشوار ہے

تیرے دم سے گرمیِ بزمِ ادب ہر آن تھی نظم وہ کہتا تھا تو جو شاعری کی جان تھی
ہر رُباعی میں عمر خیام کی سی شان تھی الغرض تخئیل تیرے تابعِ فرمان تھی
اب سخن کی بجلیاں محفل میں چمکائے گا کون
خون اک اک شعر پر آنکھوں سے رلوائے گا کون

تو گیا کیا بزم سے لطفِ سخن جاتا رہا ساتھ تیرے ارتباطِ روح و تن جاتا رہا
انجمن روتی ہے صدرِ انجمن جاتا رہا ہمنوائے بلبل و جانِ چمن جاتا رہا
زندگی کیا جبکہ لطفِ زندگی باقی نہ ہو
ساغر و مینا ہو، محفل ہو، مگر ساقی نہ ہو

غنچۂ وگل، ماہ وانجم، سب ہیں تیرے سوگوار آج بالکل بے اثر ہے حُسنِ فطرت کا نکھار
آج یوں سونا نظر آتا ہے صحنِ لالہ زار جیسے کوئی لوٹ لے کُل ساز و سامانِ بہار
دلکشی وہ صبح کے رنگیں تبسم میں نہیں
وہ سُرور و کیف موجوں کے ترنم میں نہیں

خندہ ہائے غنچۂ رنگیں سے خوش ہوتا تھا تو نالہ ہائے عندلیبِ زار پر روتا تھا تو
پرسکوں راتوں میں بھی کب چین سے سوتا تھا تو زندگی کی ساعتیں بیکار کب کھوتا تھا تو
عین معراجِ محبت حسن کا نظارہ تھا
عشق کا آغوش تیری رُوح کا گہوارہ تھا

مرنے والے تیری کس کس بات کا ماتم کریں　　جوشِ بے پایانِ اُلفت کو کہاں تک کم کریں
تیری مرگِ ناگہاں پر صبر کیونکر ہم کریں　　سچ تو یہ ہے کم ہے تیرا جس قدر بھی غم کریں

اب دُعا یہ ہے کہ اے پاکیزہ مشرب ہمنشیں
رُوح کا مسکن ہو تیری قصرِ فردوسِ بریں

---

1 : اناؤ کے مشہور وکیل سید کرامت علی کے داماد سید ابراہیم شاہ نے اپنے گھر سے ملحق شاہی مسجد میں 1880 کے آس پاس یہ مدرسہ شروع کیا جو بعد میں ان کے ہم زلف مولوی سید ضیاء الدین حسن نقوی بخاری کے نام سے مشہور ہوا۔

2 : 1۔چُنی لال 2۔ہر کھنڈی لال 3۔منو لال 4۔ہزاری لال 5۔گنگا پرساد

3 : ست نرائن کے دو بیٹے، بھگوتی پرساد اور سندر لال ہوئے۔

4 : مولوی سید ضیاء الدین حسن نقوی بخاری 1876 میں قصبہ آسیون ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ 5 جنوری 1895 میں اناؤ کے مشہور وکیل سید کرامت علی کی بیٹی سیدہ عابدہ سلطان سے ان کی شادی ہوئی۔

5 : بابو کنج کشور لال (تحصیلدار، ریاست نظام حیدرآباد) کی بیٹی راج کماری دیوی عُرف سگّن سے شادی ہوئی۔

6 : خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی (وکیل و اسپیشل مجسٹریٹ اناؤ) کے بھتیجے رواں کے دوستوں میں تھے حالانکہ وہ عمر میں رواں سے پندرہ برس چھوٹے تھے---- رواں کی خاص و عام محفل میں کسی طرح کی کوئی تخصیص و تمیز نہیں تھی۔

رواں بحیثیت شاعر

انسان میں ادبی شعور اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ تمام کلاسیکی، ادبی روایات اور مروّجہ ادبی شہ پاروں سے ذہنی مس پیدا کرتا ہے۔ اب یہ اس کے ذہنِ رسا کا کام ہے کہ اس کا مطالعہ تخلیق کی طرف گام زن کرتا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس صبر آزما مرحلے سے گزرے بغیر نہ وہ معیاری تخلیق کار ہو سکتا ہے نہ ہی مکمل طور پر اسے ادبی شعور حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب کبھی کلاسیکی اور مروج ادبی دھارے کے حوالے سے کوئی دانشور اس حقیقت کو نظر انداز کر کے کچھ بات کرتا ہے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ غالباً دانشوری کے اس معیار تک آنے کے لیے اس نے ادبی روایات کے ذخائر ماضی، حال اور مستقبل کا نہ تو مطالعہ کیا ہے اور نہ غور و فکر بلکہ یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ شاید وہ براہِ راست آسمان سے فرشتہ کی طرح اُتر کر دانشور بن گیا ہے۔ یہ روایت رہی ہے کہ چراغ سے چراغ جلے ہیں اور روایتوں سے روایات نے جنم لیا ہے اور اسی کو ارتقا کا نام دیا جاتا ہے۔ عالمِ انسانی کی تاریخ اسی ارتقا سے عبارت ہے۔

اس نظریے کے تحت ہم رواں کی شاعری کا تجزیہ کریں لیکن زماں و مکاں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے۔ وہ جس عہد میں پیدا ہوئے وہ ایسا انقلابی دور تھا جس میں اردو ادب کی تمام اصناف ایک تبدیلی کی جانب گامزن تھیں۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز نے ہندستانی

دانشوروں کے لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالکِ غیر کی ادبی تخلیقات کے مطالعہ کے نئے دروازے کھول دیے تھے۔ رواں روشن اور کھلی فضا کے ساتھ ادبی منظر نامے میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے ذوقِ ادب کو صرف غزل تک محدود نہیں رکھا بلکہ رباعی، مثنوی، نظم، قطعات اور نثر میں افسانہ، ڈراما، انشائیہ، تنقید اور تبصرے پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ محض رُباعیوں پر مشتمل ایک مجموعہ 1918 میں ادبی مرکز لاہور سے شائع ہوا، اور دس سال بعد 1928 میں تین حصّوں پر مبنی بے حد اہم مجموعہ ''روحِ رواں'' نامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

رواں کی تربیت ایک خاص تہذیبی ماحول میں ہوئی جس کی بنا پر انھیں شعر گوئی کے تمام لوازمات سے واقفیت ابتدا سے ہی ہوگئی تھی۔ کلاسیکی شاعری کے اصول وضوابط پر ان کی نظر کا عکس ان کی شاعری میں صاف نظر آتا ہے۔ اودھ کے مزاج و مذاق میں رچنے بسنے کے باوجود رواں ایسا شاعر ہے جس نے محض شوکت الفاظ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اُس کے فن پاروں میں معنویت کا دریا بھی موجزن ہے۔ پچھلے باب میں اِس کا تفصیلی ذکر آچکا ہے کہ رواں کے کلام میں جذبات کی فراوانی اور جوش وخروش ہے۔ انھیں سائنس وفلسفہ والٰہیات کے دقیق مسائل کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرنے کا ہُنر آتا ہے۔ شاعری خصوصاً رباعی میں ندرت، تازگی، سلاست اور روانی ہے۔ فطری عناصر کی ترجمانی اور جزئیات نگاری ہے۔ تخئیل فلک پیما مگر اشعار اغلاط سے پاک ہیں۔ نیز درد و تاثیر کی لہروں کے ساتھ احساسِ قومیت اور اخلاقیات کا بھرپور درس ہے۔

جدید تعلیم اور کھلے ماحول کی تربیت کے پیش نظر انھوں نے علم وحکمت اور فلسفہ و سائنس کے بیشتر مضامین کو اپنے اشعار میں خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، اُس طرح نہیں جیسے کوئی فلسفی یا سائنس داں مسائلِ حکیمیہ بیان کرتا ہے بلکہ دقیق اور خشک موضوعات شاعر کی شیریں زبان میں فطری طور پر ڈھل گئے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست کو سلیقے اور منفرد طریقے سے پرونے کی بنا پر کلام میں رنگینی و اثر آفرینی بخوبی تحلیل ہوگئی ہے۔ اُن ہی کی زبانی سُنیے۔

جو زمانے کے خیالات ہیں کرتا ہوں ادا
جانئے آپ مرے دَور کی تصویر مجھے

اور یہ تصویر بھی ایسی کہ ۔

ازل سے آئینہ بردار ہے دلِ شاعر
نہاں ہے شعر میں تاریخ ہر زمانے کی

رواں کے قلیل مگر بے حد وقیع کلام کا مطالعہ کیجیے تو اس میں شوکتِ الفاظ، تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کا برمحل استعمال ہے، وہ بھی اس انداز سے کہ جدّتِ ادائیگی اور ندرتِ فکر کے ساتھ معنویت اور تاثیر مجروح نہیں ہوتی ہے۔ موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

مرے جذبات کی ندرت ہے قائم حسنِ لفظی پر
نہیں ہے اسی لیے کچھ فکرِ اندازِ بیاں مجھ کو

جگت موہن لال رواں کے اندازِ فکر اور شعر کہنے کے طریقے پر نیاز فتح پوری اور ابوالخیر کشفی نے 'نگار' اور 'افکار' میں نیز اشتیاق عارف نے ''افشاں'' اور ''الحمرا'' میں ایک زبان ہو کر لکھا ہے کہ:

''حسن وعشق کا بیان ہو، فطرت کی عکاسی یا جذبات کی فراوانی کا معاملہ، جگت موہن لال رواں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' (''بازیافت'' مرتبہ ڈاکٹر شمسہ عارف)

نظم نگار

انیسویں صدی کے نصف دوم میں ''نظم'' کے روایتی مفہوم میں تبدیلی آئی۔ اس کی بڑی خاصیت خیالات کا تسلسل قرار دیا گیا۔ تسلسل کے احساس کے ساتھ مرکزیتِ خیال اور موضوع کو بھی اہمیت ملی۔ اس بدلے ہوئے نظریۂ شعر کو ''نظمِ جدید'' کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع اور بیان میں وسعت کی لامحدود گنجائش موجود ہے گویا نظم موضوعات کے

انتخابات، اختصار اور طوالت کی بندشوں سے یکسر آزاد ہے۔ (شروع کی ہی نظموں پر نظر ڈالیں تو موضوعات کے بیان اور اُن کے حجم کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے مثلاً کو ہی لے لیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ ''برکھارُت''، ''نشاطِ امید'' اور ''مناجات بیوہ'' سے لے کر ''مدّ و جزرِ اسلام'' تک چھوٹی بڑی نظموں کی ایک طویل فہرست ہے)۔ یہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں شاعر کسی واقعہ، خیال یا تجربہ کو تسلسل کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک شعر دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی مانند پیوست ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ ارتقائی ربط و تسلسل نظم کے آخر تک جاری رہتا ہے۔ کامیاب نظم میں ابتدا، وسط اور انتہا تین مراحل ہوتے ہیں۔ گویا نظم ایک ایسے رنگِ سخن کی طرف اشارہ ہے جس میں موضوعات کے بیان کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے جو پھیل کر Epic، مہابھارت اور فردوسی کے شاہنامے جیسی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے یا سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

شاعری کی تاریخ گواہ ہے کہ نظمِ جدید کے وجود میں آنے سے قبل دوسری ہیئتیں قائم تھیں جو صنفِ شعر کی تخصیص سمجھی جاتی تھیں۔ اس طرح نظم ان اصناف میں ایک اور کا اضافہ تھی۔ ہمارے شعری ادب نے اس اضافے کا تادیر جشن منایا، ان سے حظ اُٹھایا۔ حالی اور آزاد سے رواں تک ایک طویل فہرست ہے چونکہ رواں مشرقی علوم کے ساتھ مغربی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے 'نظم' میں انھوں نے خوب کمالات دکھائے، اور رباعی کے بعد سب سے زیادہ توجہ اس پر مرکوز کی۔ پروفیسر محمود الٰہی ''روحِ رواں'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''رواں نے نظم نگاری کی اس روایت کو بڑے خلوص اور انہماک کے ساتھ زندہ و توانا رکھنے کی کوشش کی جس کی ابتدا حالی اور آزاد سے ہوئی تھی۔ مناظرِ فطرت کی حقیقت نگارانہ عکاسی اور شعریت کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف موضوعات پر اظہار خیال ان کی نظم نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔''

عرفان عباسی ''تذکرہ شعرائے اتر پردیش'' میں رقم طراز ہیں:

''اُن کی نظمیں منظر کشی، صداقت و اصلیت، کردار کی بلندی، مضامین کی رفعت، مناظر قدرت کی عکاسی اور عمیق تجربات و مشاہدات کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔'' (ص، 134)

رواں نے اپنی 45 سالہ زندگی میں تقریباً 50 نظمیں لکھی ہیں۔ 43 نظمیں اُن کی حیات میں شائع ہوئیں بقیہ سات نظمیں محمد نسیم خاں نے ''باقیاتِ رواں'' میں شامل کی ہیں۔ زمانی اعتبار سے ان کی مشہور نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں: الوداع، سرودِ عشق، معمائے فطرت، شاعری، پپیہا، تجلی، لاوارث بچہ، شوہر کش حسینہ، آنسو، بسترِ بیمار، ویران قصرِ شاہی اور ہم، معجزۂ انتظار، منظرِ عبرت، بال گنگا دھر تلک کی وفات پر، رحلتِ بال، چتر کوٹ، پیامِ رُکمنی، گنگا کنارے کی شام، حسرت، مریضہ، گُلِ پژمردہ کی خودداری، عظمتِ توبہ، مدتوں جس کا انتظار رہا، جو دیا ہے درد تم نے تو تمھیں مجھے دوا دو، دو آئینے، جواب، دیوانے، غبارہ، شکتی بان، تلسی داس، خدا خیر کرے، ہندِ مظلوم۔

الوداع

جگت موہن لال رواں کو بچپن سے شعر و ادب کا شوق تھا، اور انگریزی سے رغبت۔ لارڈ بائرن کی نظم ''Adieu'' کو انھوں نے پہلے farewell کے عنوان سے قلم بند کیا، بعد میں اسے ''الوداع'' کا نام دیا۔ شاعر نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''بائرن جیسے باکمال شاعر کا مذاقِ سخن مجھ سے ترجمہ میں ظاہر نہ ہوسکا۔ صرف ابتدائی کوشش کا ایک نمونہ سمجھ کر اس مجموعہ میں شامل کر دیا ہے۔'' حالانکہ یہ ترجمہ رواں اور پُر کشش ہے۔ مصرعوں کی ساخت، الفاظ کی ترتیب، ان کا زیر و بم سب سلیقے سے ہے۔ اور اس کا بھی واضح اظہار ہے کہ رواں دونوں زبانوں کے مزاج و مذاق سے واقف تھے۔

سرودِ عشق

تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظم انھوں نے اس وقت لکھی جب وہ بی۔ اے۔ سال اول کے طالب

علم تھے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزی خیالات کا چربہ ہے۔ بہر حال جذبات و احساسات سے مزین اس نظم کی قرأت سے تازگی، فرحت اور معصومیت کا ملا جلا تصور اُبھرتا ہے۔ فضا اور ماحول میں اندھیرے اور روشنی کے امتزاج سے پیدا ہونے والا حسین لمس ہے جو انسان کو ہر پل اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اسلوب عام فہم ہے۔ پہلا حصّہ ملاحظہ ہو۔

جب صبح گلابی ہونٹوں سے پیغامِ نور سناتی ہے
جب شب کی اندھیری دن کی ضیا سے آ کے گلے مل جاتی ہے
جب مہرِ درخشاں کی کرنوں سے دُنیا ہوتی ہے نورانی
جب جانیں چلتی پھرتی ہیں مٹ جاتی ہے سب ویرانی
جب دھوپ کی کثرتِ تابش سے دنیا کی زمیں گرماتی ہے
قہرِ خورشید درخشاں سے جس وقت ہوا تھرّاتی ہے
جب دنیا سب تھک جاتی ہے جب نور کا دن ڈھل جاتا ہے
جب شام جہاں کو ڈھکتی ہے جب شب کا اندھیرا آتا ہے
جب رات کا دلکش سنّاٹا دُنیا پر ہوتا ہے طاری
جب سب اعضا سو جاتے ہیں جب ہوتی ہے روح کو بیداری
جب اپنی حالت جاننے والے اپنے آپ سے ڈرتے ہیں
جب اپنے گنہ آتے ہیں نظر جب دل کے داغ اُبھرتے ہیں
کچھ تم کو اس کی خبر بھی ہے ہم یاد تمہاری کرتے ہیں

معمائے فطرت

فضا اور ماحول کو فطری انداز میں پیش کرنے کا ہُنر رواں کو خوب آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں سیر و سیاحت کا شوق تھا اور شکار کے رسیا تھے۔ بچپن میں فطری مناظر دیکھنے کی ضد کیا

کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں اکثر گومتی کے کنارے بیٹھ کر خیال وخواب میں کھو جاتے تھے۔ احباب یا عزیزوں کے ساتھ کانپور جاتے ہوئے گنگا کے کنارے کھڑے گھنٹوں نظارہ کیا کرتے۔ ان کی اس کمزوری سے سبھی واقف تھے کہ رواں کو باغ اور بیاباں کی تفریح میں بے حد دلچسپی ہے۔ اسی دلچسپی کی بدولت وہ مناظر کی جیتی جاگتی عکاسی کرتے۔ وہ چاہے لہلہاتے ہوئے کھیت ہوں، پھلوں سے لدے ہوئے باغ، بہتا ہوا دریا، قاری اُن کے تصور میں گم ہو جاتا بلکہ وہ سارے مناظر حسب منشا ادب پارے کے جزو بن جاتے۔ سلیمان اطہر جاوید اسی بابت لکھتے ہیں:

> ''ان کی بہت کم منظومات ایسی ہوتی ہیں جن میں منظر نگاری سے کام نہیں لیا گیا ہو۔ وہ اس کی گنجائش نکال لیتے ہیں۔ منظر نگاری ایک وہ جس میں رواں، فطرت اور قدرتی مناظر بیان کرتے ہیں اور دوسرے جس میں کسی شئے یا واقعہ یا کسی جاندار کو دیکھ کر وہ منظر کھینچ دیتے ہیں۔'' (ص، 52)

مثلاً ''معمائے فطرت'' میں انھوں نے صبح کاذب کا سماں اور صبح صادق کا ظہور نہایت فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریکی کے سینہ کو چیرتی ہوئی روشنی نمودار ہو رہی ہے اور کائنات اس کا والہانہ استقبال کر رہی ہے۔

صبح کاذب کا سماں ، یہ صبح صادق کا ظہور
جلوۂ رنگ اُفق میں نغمہ سنجیٔ طیور

اگلے مصرعہ میں شاعر کا رازِ ہستی جہاں کہتے ہوئے نشتر زن رگ ہائے خواب کہنا غیر معمولی خیال ہے۔

وہ طبق انوار کا کہتے ہیں جس کو آفتاب
رازِ ہستیِ جہاں نشتر زنِ رگ ہائے خواب

طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی شعاعوں سے بے مثل تشبیہ دی گئی ہے۔ مختلف زاویوں سے فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے حیرت واستعجاب کا جو ماحول پیدا کیا گیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

چل رہی ہیں ہر طرف کیونکر عناصر کی کلیں
جل رہی ہیں کس طرح شمس و قمر کی مشعلیں
خود بخود چلتی ہیں یا ان کو چلاتا ہے کوئی؟
آپ ہی جلتی ہیں یا ان کو جلاتا ہے کوئی؟

اسی طرح کی بہترین عکاسی ''گنگا کنارے کی شام'' میں نظر آتی ہے۔ گیارہ اشعار پر مشتمل یہ دلکش اور موثر نظم بہترین منظر نگاری کے باعث دلآویز اور سہانی ہی نہیں بلکہ غیر معمولی نظم بن جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ سرخیاں شفق کی یہ رنگ رنگ بادل
اودے، ہرے، کبودی، زنگاری، لال پیلے
معلوم ہو رہا ہے پانی ہے اُس جگہ تک
ملتا ہے آسماں خود جھک کر جہاں زمیں سے
حدِ نگاہ پر ہے اُف کس غضب کا منظر
سبز آسمان پیچھے، نیلے درخت آگے
موجوں پہ موجیں دیکھو یوں ٹوٹی پڑ رہی ہیں
ملنے کو مضطرب ہیں گویا کہیں کسی سے
آئینہ ہے کہ پانی، اللہ ری دل فریبی
ایک آسمان اوپر ایک آسمان نیچے
اُلجھیں تو دل رُبا ہوں سلجھیں تو جاں فزا ہوں
موجیں ہیں یہ کہ بَل ہیں گیسوئے پُر شکن کے

تتلی

ہماری شاعری میں پھول کو موضوع بنا کر اس کے تعلق سے خوب لکھا گیا ہے۔ چاہے وہ گل و بلبل کی

شکل میں ہو، بھونرا،مکھی یا تتلی ہو۔ابن نشاطی کی ''پھول بن'' تو اس کی بہترین مثال ہے جس میں کنچن پٹن کے بادشاہ کو بزرگ فقیر ہر روز نئے نئے قصے سناتے ہیں۔ مرکزیت پھول کو حاصل ہوتی ہے۔ رواں نے پھولوں سے عشق کے لیے سیاہ رنگ کے بجائے رنگ برنگے پر دار کیڑے کو لیا ہے، جو بھولا،معصوم، چھوئی موئی ہے بالکل محبت کی طرح۔ وہ بہلاتا، نور پھیلاتا، فضا میں مسکراہٹ اور پاکیزگی بکھیرتا ہے۔ نظم کے تمام اشعار لطیف تشبیہات اور حسن تعلیل سے مزیّن ہیں۔ پھول یا رنگ کا ہوا کے دوش پر اُڑنا عجب کیفیت ہی نہیں پیدا کرتا ہے بلکہ قاری کو حسین و موثر جذبات سے بھی لطف اندوز کراتا ہے۔

ننھی تتلی تیری ہستی کا اگر ظاہر ہو راز
منکشف ہو رشتۂ خلق و خدائے بے نیاز

قدرت کے اس حسین کرشمہ کے راز کو منکشف کرنے کا جواز رواں نے اکثر اپنے اشعار میں اُبھارا ہے مگر تتلی کے ذریعے اُس کی نیرنگی کے حسین و معصوم لمس کا اظہار انوکھا ہے۔

اُڑتا پھرتا ہے ہوا پر ساغر زرّیں کوئی
کر رہی ہے سیر یا معشوقہ رنگیں کوئی

باعث حیرت ہے رنگینی تری ہم کیا کہیں
پھول اک اُڑتا ہوا یا باغ چھوٹا سا کہیں

کر رہی ہیں رنگ یا خود سیر دوش باد پر
ٹکڑے یا قوس قزح کے اڑتے آتے ہیں نظر

قدرتی منظر کا حسین نظارہ۔ پھول یا رنگ کا ہوا کے دوش پر اُڑنا، کس قدر حیرت ناک اور مسرور کن ہے، اِن تشبیہات کا اندازہ نظم کے آخر میں بچپن کے اس تصور سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

کوششوں پر بھی ہمارے ہاتھ کب آتی تھی تو
تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اُڑ جاتی تھی تو

شاعری

''شاعری'' کے عنوان سے ان کی دو نظمیں ہیں۔ پہلی نظم مختصر مگر نہایت پُر مغز ہے اور دوسری نظم وہ ہے جو شاعر نے بحیثیت میرِ مشاعرہ کیننگ کالج، بورڈنگ ہاؤس، بادشاہ باغ، لکھنؤ میں مشاعرہ کے آغاز کے طور پر پڑھی تھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ رواں کو مناظرِ فطرت کی عکاسی میں کمال حاصل تھا لہٰذا مذکورہ دونوں نظموں میں آزادانہ طور پر قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کا بھی ذکر نکال لیا ہے۔ عزیز لکھنوی لکھتے ہیں:

> ''شاعر کے معنی پیدا کرنے والے کے ہیں اور شاعر ہی وہ مخلوق ہے جو خالق بھی ہے۔ ان معانی کو مدنظر رکھتے ہوئے جذبۂ شاعری کو احساس قوانین وجود کہنا بلاغت کی آخری منزل ہے۔ لفظ احساس نے شاعری کو قلب کی ایک کیفیت بتایا اور ادراک سے علاحدہ کر کے اس پر ترجیح دی۔ یہاں تحقیق و تدقیق کے بعد عقل اور دماغ کی امداد سے قوانین دریافت یا وضع نہیں کیے جاتے اور پھر ان کو دیگر مسائل کے حل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا بلکہ براہِ راست تمام اسرارِ فطرت و رموزِ حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا ہے، دلیل اور بحث کو دخل نہیں جس میں غلطی کا احتمال رہے۔'' (ص،20)

شاعر اور مبصر دونوں کا کہنا یہ ہے کہ شاعری جو احکام نافذ کرتی ہے ان میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں کیونکہ اس میں قیاس نہیں مشاہدہ ہوتا ہے۔ وہ اس فنِ لطیف کا تعارف اِن الفاظ میں کراتے ہیں۔

> شاعری کیا ہے اک احساس قوانین وجود
> دل کے جذبات کا اظہار بتائید قیود

برہمن ہے دل شاعر بت فطرت معبود
جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسن نمود
جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اُبھر آتی ہے

شاعری کو فوقیت دیتے ہوئے حقیقتِ اشیا کے نکتہ کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ سائنسی علوم ابھی تک قوانین فطرت کے دریافت کرنے، ان کا دائرۂ اثر قائم کرنے اور ان کی ترتیب وتدوین میں غلطاں وپیچاں ہیں جبکہ شاعری اس کے برعکس ہے۔

نظم کے پہلے مصرع میں نفس شاعری سے بحث ہے۔ دوسرے میں اس کا عملی پہلو منعکس کیا گیا ہے۔ شاعر نہ صرف قوانین وجود کو محسوس کرتا ہے بلکہ الفاظ میں اپنے محسوسات کو تحلیل کر دیتا ہے۔ اس طرح وہی نغمے شاعری میں فوقیت، اہمیت اور افادیت حاصل کر لیتے ہیں جن میں حقیقت ہوتی ہے۔

دل ہے شاعر کا کہ اک منزل انوار جمال
اور جولانگہ دل وسعت میدان خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مست سخن صاحب قال
بزم فطرت میں ہر اک چیز کو آجاتا ہے حال
کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

خوب صورت تراکیب سے مُزیّن یہ بند قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پہاڑ کا جُھکنا یا چشمے کا رُکنا غیر فطری قرار پاتا ہے کیونکہ ایک بلندی کی جانب گامزن ہوتا ہے تو دوسرے میں ٹھہرنے کی طاقت نہیں لیکن وجد کا عالم اور سرشاری کی کیفیت ناممکن کو ممکن میں بدل دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

عزیز لکھنوی شاعری کے وضعی اور موضوعی پہلوؤں کو موضوع بحث بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ نظم کے آخری ٹکڑے میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ فن شاعری کیا ہے یعنی قیود کی تائید اور پابندی ہو۔ وزن وقافیہ قائم رکھتے ہوئے جذبات کا برملا اظہار ہو۔ رواں نے تشبیہ کی لطافت وندرت کے علاوہ نفسیات کے اس مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس میں انسان کے علم کی ابتدا خارجی اشیا سے ہو کر انتہا اپنی ذات کے علم ومعرفت پر ہوتی ہے، اس کے بعد معرفت کے الگ الگ درجات ہیں۔ نظم کے چوتھے مصرعہ میں اس کا مدلل جواب ہے کہ حجاب ظاہری آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں اور یہی معرفت وسلوک کا مقام ہے۔

دل کو برہمن اور فطرت کو بت کہنے سے بے شمار خوب صورت مناظر، جن میں ہر ایک تجلیات و معنی سے لبریز ہے، آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ان کی صراحت ناممکن ہے صرف دل لطف وانبساط اُٹھا سکتا ہے۔ آئندہ اشعار میں ایسے روشن مظاہر ہیں جن کی ضو پاش کرنوں سے آنکھیں چکاچوند ہوتی ہیں۔

نورِ شمع دل و جاں دائرۂ شعر میں ہے
وسعتِ کون و مکاں دائرۂ شعر میں ہے
جلوۂ برقِ تپاں دائرۂ شعر میں ہے
الغرض سارا جہاں دائرۂ شعر میں ہے

جس بلندی پہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
سچے شاعر اُسے ٹھکراتے ہوئے چلتے ہیں

شاعر کی کج کلاہی اُسے دنیاوی جاہ وحشم سے بیگانہ کر دیتی ہے اور یہ بیگانگی اُس کی انانیت کو مہمیز کرتی ہے۔ وہ محبت کے حسین تصور میں غرق ہو کر حقائق کے موتی تلاش کرتا ہے۔ کوہ وصحرا، پہاڑ و دریا کے توسط سے وہ کائنات کے اسرار ورموز ہی منکشف نہیں کرتا ہے بلکہ ایک ایسے لمس کا احساس بھی دلاتا ہے جو ذہنی اور قلبی سکون کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور انسان ازل سے پائیدار سکون کا

متلاشی ہے۔ اُس کی نظر ہمیشہ قدرت کے نظاروں پر جا کر ٹھہرتی ہے اور یہیں سے شروع ہوتے ہیں فنا اور بقا، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریے، حقیقی اور مجازی کے پردے کیونکہ بظاہر یہی وہ مناظر ہیں جو دراصل نورِ حقیقت کے پردے تھے جن کو اٹھا کر دل حریم حسن کی حدود میں داخل ہوا۔ اور اس مقام پر پہنچنے کے بعد دل دل نہیں رہتا ہے بلکہ آئینہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں حُسنِ مطلق اپنے جلوے دیکھتا ہے۔

وجودی نقطۂ نظر کی شباہت لیے ہوئے اشعار پہلے بند سے ہی انوار مظاہر کا تصور پیش کرتے ہیں جبکہ سائنس کے مساعی میں سب سے اہم یہ کام ہے کہ موجودات عالم میں، جو بظاہر متضاد ہیں، یہ ثابت کرتے ہیں کہ تفریق میں ترتیب اور ترتیب میں تفریق ہے۔ اشرف المخلوقات ہی نہیں، حیوانات، نباتات، چرند و پرند بھی ایک جوہر کے مظاہر ہیں۔ شاعر نے سائنس، فلسفہ اور تصوف کو خوبی سے موضوعِ بحث بنایا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاعری مجاز و حقیقت کے قریب ہے، بس دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔ اسی لیے شاعر محسوس کرتا ہے اور محسوسات کو سائنس کوئی مقام و مرتبہ نہیں دیتا ہے۔ اس پوری بحث میں الفاظ کی نشست، مصرعوں کی بے ساختگی، روانی اور جوش قابلِ داد ہے۔

لاوارث بچہ

نہایت درد انگیز پیرائے میں لکھی گئی یہ خطابیہ نظم قاری کو سماج کے گھناؤنے فعل پر شرمندہ کرتی ہے کہ یہ فعل فردِ واحد کا نہ رہ کر معاشرہ کا ہو جاتا ہے اور اس میں جذبات و احساسات، ہوس کا روپ اختیار کر کے کس کریہہ شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس کی فن کارانہ عکاسی ہے۔ شاعر اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتا ہے کہ میں ایک سب انسپکٹر کے پاس تھانہ میں سرکاری کام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسی درمیان چوکیدار ایک نوزائیدہ بچہ کو لے کر داخل ہوا۔ بچہ بے حد حسین تھا۔ اس کے نقش و نگار جاذبِ نظر تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ بچہ ایک گھورے پر ملا ہے تو اس لاوارث کو دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوئی اور یہ نظم اسی کا اظہار ہے جس میں بچہ کی معصومیت، ماں کی بے

رحمی اور باپ کی عیاشی کا بیان ہے۔اور ان سب میں ایک ربط ہے۔ مجموعی تاثر معاشرے کے خلاف غصہ کی شکل کو لیے ہوئے ہے۔افسوس صد افسوس کرتے ہوئے وہ آخر میں کہتے ہیں۔

منظرِ عالم سے تو جس دم کرے گا آنکھ بند
یہ کہیں گے بھر کے ٹھنڈی سانس تیرے دردمند
''پھول تو کھل کر بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے''
لطف تو جب ہے کہ ہم کو کچھ بھی تیرا غم نہ ہو
رونے والے روئیں لیکن آنکھ اپنی نم نہ ہو
کوئی گر پوچھے رواں ہم سے کہ یہ کیا ہو گیا
ہم کہیں دریا سے قطرہ مل کے دریا ہو گیا

شوہر کُش حسینہ

نظم بقول مصنف ایک حقیقی واقعہ پر مبنی ہے کہ وہ جب ایل۔ایل۔بی۔کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ایک خاتون اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوتی ہیں۔حیرت واستعجاب سے بھرا ہوا واقعہ شاعر کو بے حد متاثر کرتا ہے اور وہ اسے نظم کے پیرائے میں ڈھال دیتا ہے۔دعویٰ اور دلیل کے ساتھ شروع ہونے والی اس نظم میں ایک طرف قاتل حسینہ کا خداداد حسن دل کو مسحور کرتا ہے تو دوسری طرف مقتول کی ناکردہ گناہی فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ستم پرور اداؤں اور شکوہ بھری آہوں کے تضاد و تصادم کو عبرت کی تصویر بنا کر رواں نے پیش کیا ہے جو سبق آموز بھی ہے اور عبرتناک بھی۔

بے وفا سمجھوں تجھے یا با وفا سمجھوں تجھے
حُسن فطرت کے فرشتے بول کیا سمجھوں تجھے
حُسن تیرا دیکھ کر یہ تیری حالت دیکھ کر
کیا کہوں جو کچھ گزرتی ہے دل بیتاب پر

کام تو نے اے حسیں جلاد کا کیوں کر کیا؟
خون اپنے شوہر ناشاد کا کیوں کر کیا؟
گرچہ ماہ و سال کیا صدیاں گزر جائیں یوں ہیں
خون شوہر کا وہ دھبا ہے کہ مٹ سکتا نہیں
سچ بتادے تجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی
حسن عالم سوز کو کیوں تجھ سے ایسی کد ہوئی

ویراں قصرِ شاہی اور ہم

اس نظم کے تعلق سے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ رواں کو سیر و سیاحت سے کافی دلچسپی تھی۔ برج بھوی کو دیکھنے وہ کئی بار آئے۔ متھرا، آگرہ اور فتح پور سیکری ہوتے ہوئے وہ بھرت پور تک نکل جاتے تھے۔ فتح پور سیکری میں تو ان کے قرابت دار بھی رہتے تھے، اسی بہانے وہ وہاں قیام کرتے۔ ''انارکلی'' ڈراما انھوں نے یہیں رہ کر خلق کیا۔ یہ نظم مغل شہنشاہ اکبر کی یاد دلاتی ہے جنھیں رواں بہت پسند کرتے تھے۔ فتح پور سیکری کے قیام کے دوران وہ سکندرہ جاتے۔ اکبر کے مقبرے کو دیکھتے اور قومی یکجہتی کو یاد کرتے۔ ڈرامائی انداز اور استفہامیہ لہجہ میں لپٹی ہوئی یہ نظم بتاتی ہے کہ یہ پُر شکوہ تاریخی عمارتیں محض یاد ماضی کی جھلکیاں نہیں ہیں بلکہ مناظر قدرت کی طرح جذبات و احساسات کی محرک بھی ہیں۔ ان کی دیرینہ عظمت، شان وشوکت کا تصور بہت کچھ یاد دلاتا ہے اور جب یہ یادیں بے حد حسین ہوں تو ان کی کسک اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اکبر، اس کے نورتن، دین الٰہی۔ عوام سے محبت یہ سب تصورات ایک خاص سلیقے اور موثر لہجے میں بیان کیے گئے ہیں جو ذہن پر چھا جاتے اور دل کو موہ لیتے ہیں۔ آغاز نظم کے تیور ملاحظہ ہوں۔

قدرتاً ہے مجھ کو شوقِ سیرِ آثارِ کُہن
فطرتاً ہے مجھ کو ذوقِ علمِ اسرارِ کُہن

جب کوئی کہنہ مناظر دیکھنے جاتا ہوں میں
اک عجب عالم میں اپنے آپ کو پاتا ہوں میں
مجھ کو اُجڑی بستیوں سے خاص دلچسپی سی ہے
اور اُن کے ساکنوں سے ایک ہمدردی سی ہے
غور کرنا ٹوٹی دیواروں پہ بھاتا ہے مجھے
ایسا اُجڑی بستیوں میں لطف آتا ہے مجھے
خواہ مسجد خواہ مندر خواہ ہو کوئی مکاں
نقشِ کہنہ میں ہیں اُس کے خاص جذبات نہاں

معجزۂ انتظار

کا بنیادی موضوع ایک ایسی عورت کے گرد گھومتا ہے جو سب کچھ بھول کر محبوب کے انتظار میں گم صم بیٹھی ہوئی ہے۔ رقتِ جذبات سے بھری ہوئی اس نظم میں محاکات کا کمال ہر مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔

وقتِ غروبِ آفتاب حالتِ انتظار میں
بیٹھی ہے ایک مہ جبیں محو خیالِ یار میں
اُلجھے ہوئے ہیں سر کے بال جامہ تمام پُر شکن
چہرہ پر ایک سادگی جس میں ہزار بانکپن

قاعدۂ شمار سے ختم ہے اب فراقِ دوست
اس لیے اور تیز ہے آتشِ اشتیاقِ دوست

انتظار کی گھڑی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔ ایک ایک لمحہ کس کرب سے گزرتا ہے۔ خدشات کیا کیا گُل کھلاتے ہیں، وسوسے کیا رنگ لاتے ہیں، ان سب کا اظہار مذکورہ نظم میں بڑے قرینے سے کیا

گیا ہے۔ سادگی کا یہ ہنر ملاحظہ کیجئے۔

کوئی صدا سُنی اگر، دل نے کہا وہ آ گئے
کوئی چلا اِدھر اُدھر دل نے کہا وہ آ گئے

''بسترِ بیمار''، ''مریضہ'' اور ''منظرِ عبرت''
خاص واقعہ اور حادثہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ پہلی نظم میں حیدر آباد کے ایک دوست کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کا ذکر ہے۔

یاد آتے ہیں اُسے آپ اپنے اعمالِ قبیح
دل ہی دل میں اپنے ہوتا ہے نہایت شرمسار
چاہتا یہ ہے کرے اُن کی تلافی کچھ، مگر
یہ خیال آتا ہے آخر ہے حیاتِ مُستعار

دوسری نظم بھی انھوں نے الہ آباد کے ایک رشتہ دار کی علالت سے متاثر ہو کر لکھی۔

کہتے ہیں بیمار مجھ کو میرے سارے چارہ گر
کچھ حقیقت کی نہیں لیکن انھیں اصلاً خبر
سعی لا حاصل ہے بیمارِ محبت کا علاج
اس قدر آساں نہیں ہے دردِ اُلفت کا علاج

اسی طرح تیسری نظم بھی ایک عزیزہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

منظرِ عبرت ہے اے رہرو ذرا تھم دیکھ لے
روبرو آئینۂ اسرارِ عالم دیکھ لے
حالتیں دیکھے گا پھر ایسی بہت کم دیکھ لے
حسرتوں کا خون، ارمانوں کا ماتم دیکھ لے

تینوں نظموں میں ذاتی کرب کے ساتھ سماجی جبر صاف جھلکتا ہے۔ رسم و رواج، توہم پرستی

اور جھوٹی شان وشوکت پر گہرا طنز ہے۔ایسا طنز جو قاری کو بے چین کر دیتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی اور رواں کی دوستی محض اس وجہ سے نہیں تھی کہ دونوں ہم وطن تھے بلکہ دونوں ہم خیال بھی تھے اور دونوں بال گنگا دھر تلک سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ 22 جون 1908 کو ایک باغیانہ مضمون (مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی) شائع کرنے کے جرم میں حسرت موہانی کو جیل بھیج دیا گیا، اور ان کی گرفتاری کے دوسرے دن تلک کو بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا۔اُن پر بھی باغیانہ مضمون شائع کرنے کا الزام عائد گیا گیا تو بقول رواں ''میں اس خبر کو سن کر بے چین ہو گیا۔سوچا تعلیم پوری کرنے کے بعد مطبع قائم کروں گا، اخبار نکالوں گا اور ظالموں کے خلاف لکھوں گا۔'' انٹرمیڈیٹ کرتے ہی انھیں اطلاع ملی کہ حسرت نے اعلان کیا ہے کہ ''ہم پالیٹکس میں مسٹر تلک کی پیروی اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں''[1] تو انھیں بے حد خوشی ہوئی، اور حسرت کی اس غزل کو جوان کے معلمِ سیاست کے بارے میں تھی گنگناتے رہتے۔

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حُبِّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقیں و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بِنا آزادیٔ بے باک کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قیدِ محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن

ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربّ ذوالمنن

1930 میں تلک کی موت پر حسرت نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا، دُنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زور اُن کا
اب رہ کے بہشت میں نزد خدا، حوروں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندی کا مضبوط ہے جی، گیتا کی بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی پھر آئیں گے مہراج تلک''

تو جگت موہن لال رواں نے بھی ''رحلتِ بال'' اور ''بال گنگا دھر تلک کی وفات پر'' کے عنوان سے دو نظمیں قلم بند کیں۔ یہ نظمیں محض خراج عقیدت نہیں ہیں بلکہ حب الوطنی کے جذبے کو بھی نمایاں کرتی ہیں اور پیغام دیتی ہیں کہ ہندستانی عوام کو خودداری اختیار کر کے ظالم حکومت کی خوشامد سے باز آنا چاہیے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حبیب قوم جو دکھ دوسروں کا سہتا تھا
کسی کا درد ہو وہ اشک بار رہتا تھا
زبان و دل میں تفاوت نہ جس کا تھا اصلاً
وہی عمل بھی کیا دل سے جو زباں سے کہا
کڑی اٹھائی، سہیں سختیاں، وطن چھوڑا
شکن جبیں پہ آئے مگر مجال یہ کیا
ارادہ باندھ کے ہلنا نہ اُس نے سیکھا تھا
قدم بڑھا کے پلٹنا نہ اس نے سیکھا تھا

''فخرِ قوم'' پر لکھی گئی یہ نظم جس میں رواں نے اپنے ہیرو کو 'حبیبِ قوم' قرار دیا ہے، انتہائی متاثر کن ہے۔ یہ صرف اُن کی ہی نہیں بلکہ تمام ہندستانیوں کے دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اور یہ پیغام دیتی ہے کہ وطن کی عظمت اور ملک کی آزادی کے لیے تلک اپنا کام کر چکے، اب ہمارا فرض ہے کہ اُن کے نقشِ قدم پر چل کر آزادی حاصل کریں۔ اس مقصد کے تئیں جو بھی پریشانیاں، مصیبتیں آئیں، انھیں ہنستے ہوئے برداشت کریں۔ ہمت، حوصلہ اور عزم سے بھری ہوئی نظم کا اختتام اِس شعر پر ہوتا ہے۔

تلک نہیں ہے مگر اُن کا کام باقی ہے
چراغِ راہِ ترقی یہ نام باقی ہے

اسی طرح ''پیامِ رکمنی''، ''شکنتی بان'' اور ''تلسی داس'' میں جذبات کی عکاسی کے ساتھ بھرپور ڈرامائیت ہے۔ مذہبی شخصیات اور مقدس اقوال کے توسط سے انھوں نے انسانیت، محبت اور مروت کا پیغام قلم بند کیا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ان نظموں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''رواں کو جذبات کی عکاسی، کردار نگاری اور محاکات بیانی پر جو قدرت حاصل ہے اس کا اظہار ان مرثیہ جیسی نظموں سے ہوتا ہے۔ 'پیامِ رکمنی' سری کرشن جی کی حیات کے واقعات سے لی گئی ہے۔ مہابھارت سے اخذ کردہ یہ واقعہ منظوم کر کے رواں نے فنِ شاعری پر اپنی دست رس اور ڈرامائیت سے آگہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے ان میں کئی سبق پوشیدہ ہیں۔ 'تلسی داس' بھی معرکہ آرا نظم ہے۔ تلسی داس نے سنسکرت کی والمیکی کو عوامی زبان میں ترقیم کیا۔ رواں نے اس نظم میں اپنی شاعری کا گویا سارا زور ختم کر دیا ہے۔'' (جگت موہن لال رواں، ص، 51)

شاعر نے ''پیامِ رکمنی'' میں ایک المیہ کو اُبھارا ہے جو قاری کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

وفورِ غم گدازِ سوزِ باطن کو سمجھ لینا بہت ممکن بظاہر غیر ممکن کو سمجھ لینا
مرا اب روزِ آخر آج کے دن کو سمجھ لینا ندائے کفش پا تم جانِ روکمن کو سمجھ لینا
لبوں پر آ کے دم اب طالبِ امداد ہوتا ہے
نکل جائے کہ ٹھہرے کہیے کیا ارشاد ہوتا ہے

مکالماتی انداز میں عشق کی ناکامی کی روداد کے بعد وہ ''تلسی داس'' کی گراں قدر خدمات کو سمیٹے ہوئے نظم خلق کرتے ہیں۔ انھوں نے پوری نظم میں یہ تاثر ابھارا ہے کہ جس وقت مذہب کی حالتِ زار ہو چکی تھی، ہر طرف افراتفری تھی۔ لوگ اپنی عزت و ناموس کی دھجیاں اُڑا رہے تھے، اُس پُرآشوب دور میں تلسی جیسا مصلحِ قوم پیدا ہوا۔

اک زمانہ تھا کہ غارت ہو رہے تھے اہلِ ہند اپنا مذہب اپنے ہاتھوں کھو رہے تھے اہلِ ہند
اک عجب خوابِ گراں میں سو رہے تھے اہلِ ہند اپنے ہی اعمال کو خود رو رہے تھے اہلِ ہند
غرق ہونے پر تھا جب بیڑا ہماری قوم کا
گوشۂ عزلت میں تلسی نا خدا پیدا ہوا

اور مختلف تاویلوں سے ان کی صفات و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے نظم کے آخر میں کہتے ہیں۔

دل دہل جاتا ہے ہم جس وقت کرتے ہیں خیال تیری رامائن نہ ہوتی گر تو ہوتا کیسا حال
چند دن گر اور چلتا وہ زمانہ اپنی چال ہم کو کر دیتی ضعیف الاعتقادی پائمال
رائے یہ میری نہیں، فتویٰ ہے ساری قوم کا
تیری رامائن نہیں، نغمہ ہے ساری قوم کا

''شکتی بان'' بھی قابلِ رشک نظم ہے اس میں 'رامائن' کے اُن لمحات کو قید کر لیا گیا ہے جو آفاقی نقطۂ نظر کے ہیں اور محبت، مساوات، بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔

ماں باپ سے چھٹے تم منھ بھائیوں سے موڑا جنگل کی راہ پکڑی اپنے وطن کو چھوڑا
خاطر سے جس کی تم نے اپنوں سے رشتہ توڑا دل کر رہے ہو چھن کیوں آج اس کا تھوڑا

مجھ کو بھی ساتھ لے لو گر خواہشِ سفر ہے
تنہا یہاں نہ چھوڑو ، یہ دشمنوں کا گھر ہے

''خدا خیر کرے''

ملک والوں کے یہ اطوار خدا خیر کرے
اور یہ قوم پر ادبار خدا خیر کرے
ہوتے دو چار ہی قیدی تو تسلی ہوتی
قوم کی قوم گرفتار خدا خیر کرے

''ریشم کنور'' اور ''دو آئینے'' (یعنی ایک ہندو بیوہ سے پیام شادی اور بیوہ کا جواب)

آگے کیا لکھوں کہ خود آپ ہیں ذی فہم و شعور
اعتقادات سے مجبور ہوں ، دل سے معذور

میں ان کی معاشرتی فکر بہت بالغ نظر آتی ہے۔ وہ مذہب، معاشرہ اور رسم و رواج کے نام پر ہونے والے استحصال کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔

رسم ستی پر لکھی گئی نظم ''ریشم کنور'' تو بہت مشہور ہوئی ہے۔ یہ ان کی غیر مطبوعہ نظم ہے۔ 38 بندوں پر مشتمل ''ریشم کنور'' ایک ایسے دلدوز واقعہ کی حقیقی تصویر ہے جس کو قاضی لطافت حسین ساکن سید واڑہ قصبہ سانڈی ضلع ہردوئی نے 17 رجون 1934 کو بچشم خود دیکھا تھا۔ چودھرانہ (اناؤ) میں منعقد ایک محفل میں مذکورہ واقعہ کا ذکر آیا تو رواں نے بے حد متاثر ہو کر اُسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ نظم کا مرکز و محور سانڈی تحصیل کے پنڈت چھوٹے لال کی بڑی لڑکی کنور دیوی ہے جو اپنے لمبے گھنے بالوں کی وجہ سے ریشم کنور کہلاتی ہے۔ اُس کی شادی ضلع ہردوئی کے پنڈت دین دیال کے منجھلے بیٹے رام پرساد عرف بنسی دھر سے ہوتی ہے۔ کم عمری کی بنا پر اس کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ کہ اچانک ایک روز خبر ملتی ہے ''بنسی دھر کی طبیعت بہت خراب ہے''۔ وہ اپنے

ماموں کے ساتھ شوہر کی عیادت کو پہنچتی ہے مگر دیدار ہونے سے پہلے بنسی دھر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ لاش "انتم سنسکار" کے لیے گنگا روانہ ہوئی تو ریشم کنور نے بھی ستی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تحیر، تجسس اور حیرت میں اُس وقت اضافہ ہوتا ہے جب لاش کو چتا پر رکھ کر آگ لگائی جاتی ہے تو اپنی سسرال کے باہر، پیپل کے نیچے بیٹھی ریشم کنور کی اُنگلیوں سے شعلے نکلنے شروع ہوتے ہیں۔ قاری اب گنگا بنسی دھر کے جسد خاکی کو چتا پر جلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ریشم کنور کو بھی زندہ راکھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مسدّس کی شکل میں لکھی گئی اس نظم کو رواں نے محاکات کے سہارے حقیقی تصویر کی شکل دے دی ہے۔

مسدّس کی ہی شکل میں رواں نے شہنشاہ غزل میر تقی میر کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

میر ترا اندازِ سخن ہے یا حسنِ اعجاز کوئی
اللہ اللہ تیری رفعت کی حدِّ پرواز کوئی
تیرا ہم آہنگ کوئی ہے اور نہ ہے ہمراز کوئی
تیری صریرِ خامہ ہے یا نوائے دل کی آواز کوئی
اردو کے سرتاجوں کا ہم تجھ کو سمجھتے ہیں سرتاج
تیری تقلید اہلِ سخن کے واسطے ہے اک معراج

نظم کے آخر میں رواں نے نہ صرف میر کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے بلکہ اس ناقدری کو وہ ادب کی ناقدری تصور کرتے اور اس پر اظہار تاسف کرتے ہیں ۔

صد حیف اے افتادِ زمانہ حیف اے ناقدری سخن
ایسی گمنامی میں پڑا ہو ایسا یکتا ماہر فن
کیسا تاج کہاں کا روضہ کیسی بہار صبح چمن
خود تیرے اشعار میں ہے تیرا مسکن تیرا مدفن

سوچو تو اے اہل نظر کیا یہ حالت مذموم نہیں
آہ کہاں ہے میر کا مرقد یہ بھی کچھ معلوم نہیں

رواں کی بیشتر نظموں میں براہِ راست تخاطب کا طریقہ اور وضاحتی انداز ہے۔ فطرت کے خوب صورت مناظر کو پیش کرنے میں مہارت ہے۔ لہجہ شکوہ شکایت کا مگر منطقی دلائل سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ''پتھر کوٹ''، ''حسرت''، ''گلِ پژمردہ کی خودداری''، ''مدتوں جس کا انتظار رہا''، ''ہندِ مظلوم'' اور ''غبارہ'' ایسی نظمیں ہیں جن میں حزن ویاس کی کیفیت کے باوجود تازگی اور بے نیازی کا احساس ہے۔ موسمِ بہار، چاندنی راتیں اور خوشگوار ہوائیں عاشق کے لیے نہیں ہیں کیونکہ ان میں محبوب کا رومانی تصور نہیں، اس سے بہتر تو سورج کی گرم شعاعیں ہوسکتی ہیں اگر وہ اس کے لمس کا پیغام دے رہی ہیں۔

انھوں نے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے احساسات و جذبات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے مگر رومانیت حاوی رہی ہے۔

غزل گو

اردو شاعری کا نام آتے ہی 'غزل' اپنی پوری جلوہ سامانی کے ساتھ ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ عوام وخواص کی یہ پسندیدہ صنفِ سخن حالی کی ناپسندیدگی کے باوجود ہر زمانے میں ممتاز اور سرمایۂ افتخار رہی ہے۔ دکنی شعرا نے اس صنف کے توسط سے مشترکہ ہند ایرانی کلچر کی نمائندگی کرتے ہوئے زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ دہلوی دبستان نے مقامی رنگ و آہنگ میں انسانی احساسات وجذبات کی رنگارنگی کو پیش کرتے ہوئے دہلی کی زبوں حالی اور تہذیبی زوال کا پردہ چاک کیا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ نے حیات وکائنات کے معروضی مطالعہ کے ساتھ نسائیت اور ہوس کے موضوع کو بھی مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت اور ضرورت کے تقاضے کے پیش نظر غزل نے اپنے دامن کو وسیع کیا اور زندگی کے گوناگوں موضوعات و مسائل کی ترجمانی کی۔ معاشرتی وتمدنی مسائل سے لے کر فلسفیانہ

موشگافیاں، تصوف کے رموز و نکات، سیاست کی شعبدہ بازیاں غرض تمام موضوعات کی ترجمانی اپنے مخصوص سانچے میں ڈھال کر کی لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اپنے مزاج اور اپنی مخصوص روایات کی پاسداری کی شناخت کو غزل نے کبھی نہیں چھوڑا۔ اس کی رمزیت اور ایمائیت بدستور قائم رہی جو اس کا سب سے بڑا حُسن ہے اور جس سے شعر کی معنویت میں تنوع اور نیرنگی پیدا ہوتی ہے۔ رمز نگاری تخیل کا ایک کرشمہ ہے جس میں شاعر اپنے تاثرات کا اظہار اشاروں میں کرتا ہے تاکہ اس کے ذوق و وجدان کی آئینہ داری ہو سکے۔ اُسی طرح غزل کی ایک اور بڑی صنفی خصوصیت اس کی داخلیت ہے۔ داخلیت سے مراد شاعر کا اپنے واردات قلبی کا موثر اظہار کرنا ہے جس میں شاعر رمزیت و ایمائیت کے پردے میں کسی تجربے کی ترسیل کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے مخصوص استعاراتی نظام کے پیرایے میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزل کا فن اختصار کا فن (Micro art) ہے اور یہی ایجاز اس کا اعجاز ہے۔ دو مصرعوں کی محدود کائنات میں ایک مکمل تجربۂ زندگی کا اظہار جس Sense of gravity کے ساتھ غزل میں ہوتا ہے اس کی مثال دنیائے ادب میں نہیں ملتی۔

رواں کو بچپن سے شاعری خصوصاً غزل سے زیادہ اُنسیت تھی۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی ''نقدِ رواں'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''رواں کی غزل نظم سے، اور نظم غزل سے بہتر ہوتی ہے۔ انھوں نے دونوں کا معیار بہت بلند رکھا ہے مگر دلدادہ غزل ہی کے تھے۔''

صنف 'غزل' کی تعریف میں لکھا گیا جگت موہن لال رواں کا مندرجہ ذیل بند بہت مشہور ہوا ہے۔

اللہ اللہ یہ ہے وسعتِ دامانِ غزل
بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم پنہائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
پوچھیے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینہ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

کیفیات کے اعتبار سے دیکھیں تو رواں کی غزلوں میں رعنائی، بانکپن، جوش اور اُمنگ ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہو یا رازِ زندگی کا اظہار، رواں نے ان سب کا بیان مخصوص انداز میں کیا ہے۔ جمالیات، محبت اور فطرت کی آمیزش کے ساتھ زبان کا لطف اور بے ساختگی بھی ملاحظہ کیجئے۔

آخر امکان وفا کی کوئی تدبیر بھی ہے
تم تو ہر وعدہ کو کہتے ہو ہمیں یاد نہیں
دیکھیں گرتی ہے قفس پر کہ چمن پر بجلی
آج یا میں ہی نہیں یا مرا صیاد نہیں
میں یکجا ہی کرتا تھا اپنے حواس
کہ ان کا مرا سامنا ہو گیا
رواں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا
مری آنکھوں سے اوجھل ہونے والے اتنا بتلا دے
ترے امکاں میں ہے کیا میرے دل سے دُور ہو جانا

ان کے یہاں فلسفہ و اخلاق کے مسائل بھی رنگِ تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عزیز لکھنوی ''روحِ رواں'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''غزلیات میں کہیں فلسفہ و اخلاق کے مسائل ہیں مگر رنگِ تغزل میں ڈوبے۔ کہیں تصوف کی عرفان زار تجلیاں ہیں کہیں روحانی نغمے۔ کہیں وجدانی ترانے جس کے ساتھ روانی و سلاست اور جوش و خروش، سوز و گداز

کی بہتر سے بہتر تصویریں اس کاغذی پیرہن میں پائیے گا۔ درد ہر شاعر کا
حصہ نہیں، رقص کرنے والے اشعار کہنا ممکن مگر درد دل پیدا کرنا محال
ہے۔" (ص، 34)

راز زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ دنیا کی بے ثباتی کو خاص موضوع بتاتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے۔

جانے والے چل بسے دنیا کی بستی چھوڑ کر
رونے والے ایک دن کیا عمر بھر رویا کریں

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے
یہی قانون فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے

ہر ذرہ ہے ازل سے نغمہ طراز ہستی
اس پر بھی ہے ابھی تک بے ربط ساز ہستی

نفس نفس متغیر ہے عالم فانی
کسی کو آئے تو کس طرح اعتبار آئے

سو رنگ کے نقشے ہیں سو رنگ کی تصویریں
پھر بھی ورق ہستی سادا نظر آتا ہے

آیا ہوں فاصلے سے جانا ہے دُور مجھ کو
دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر گیا ہوں

رواں کی غزلوں میں رنج ونشاط کا حسین امتزاج ہے۔ اس امتزاج میں کیف آگیں خیال انگیزی، جذبات کا وفور، والہانہ شیفتگی اور سرشار کردینے والی کیفیت ہے۔ زندگی کو مختلف رنگوں اور جھلکیوں میں دیکھنے والا یہ شاعر، اظہار عشقیہ جذبات کی وساطت سے ہی کرتا ہے جن میں واردات قلبی، خوشی وغم کی ملی جلی پرتوں میں موجزن ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس دل کو کیا کہوں میں ضدین کا ہے طالب
لذت تلاش کی ہے ملنے کی آرزو بھی
طلسم وعدۂ فردا کے توڑنے والے
تجھے خبر نہیں کیا لطف انتظار میں ہے
ہر اک مشکل کو حل کرتی ہے جب موت
کروں آگے کسی کے سر کو خم کیا
آیئے حسرت کدہ میں دل کے لیکن اس طرح
جو بجھی شمعیں ملیں اُن کو فروزاں کیجئے
یہ بھی کیا کم ہے میری تسکینِ خاطر کے لیے
اُٹھ گیا ہے وہ بھری محفل سے شرمایا ہوا

انسان مظہرِ صفات الٰہی ہے۔اس کی حقیقی عظمت وقوت کو رواں یوں اُجاگر کرتے ہیں۔

مضمر ہیں میری ذات میں اسرارِ کائنات
میں آپ راز آپ ہی خود شرحِ راز تھا
یقیناً وسعت امکان انسانی یہاں تک ہے
کہ میدانِ عمل اس کا زمیں سے آسماں تک ہے
فنا ہو کر بھی ذرے خاک کے پرواز کرتے ہیں
رواں یہ قوت نشو و نما تھی میرے پیکر میں
وہ بادہ نوشِ حقیقت ہے اس جہاں میں رواں
کہ جھوم جائے فلک گر اُسے خمار آئے
اُتارے دیتے ہیں لاشہ مرا کہاں احباب
یہ آسماں نہیں اس زمین کے قابل

بتوں کا ذکر کرتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں
فرشتے بھی نہیں کرتے جو آدم زاد کرتے ہیں

علم واخلاق کی باتیں، اساطیری کردار و واقعات اور مذہبی روایات انسان کی سائیکی سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری شاعری میں اساطیر کا استعمال، تلمیحی اشارے فن کار کے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری غور و فکر پر مجبور ہو کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مفہوم کی تفہیم کے بعد تمام تاریخی واقعات اس کی نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں اور اسے ذہنی لطف و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ روان نے بھی اس سے بہت کام لیا ہے۔

داستان شوکت ماضی سے کچھ حاصل نہیں
خود اگر کچھ ہوں تو چھیڑیں قصۂ اجداد بھی
حرص دنیا میں گر انسان گرفتار نہ ہو
دل پریشان نہ ہو روح کبھی خوار نہ ہو
ایک ہی دریائے بے پایاں کے قطرے ہم ہیں سب
حیف ہے گر ہم میں کوئی جانب دریا نہ جائے

جگت موہن لال روان کی تربیت جس تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ہوئی اور جو معاشرہ انھوں نے اپنے قرب وجوار میں پایا اُس کی بنا پر انھیں شعر گوئی کے تمام لوازمات سے واقفیت ابتدا سے ہی ہوگئی تھی۔ کلاسیکی شاعری کے اصول وضوابط بھی انھوں نے اسی پس منظر میں سیکھ لیے تھے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری بیسویں صدی کے اس زمانے کی ہے جب نئے Tools استعمال کیے جا رہے تھے مگر احباب کی صحبت اور بزرگوں کی تربیت نے ایک نکھار پیدا کر دیا۔ شکار کا شوق، گومتی اور گنگا کے حسین مناظر ان کی غزلوں میں بھی رواں دواں ہیں۔ صبح کے منظر کا یہ خاص انداز دیکھئے۔

طلوع صبح نے دنیا کی حالت اور ہی کر دی
بدل جاتی ہے مٹی جیسے دست کیمیا گر میں

آدھی رات کے منظر کی مصوری ملاحظہ ہو۔

نیم شب دنیا کا سناٹا وہ تاروں کا سکوت
جیسے بزم آرائے فطرت محو خواب ناز ہے

رواں کا عقیدہ تھا کہ ذرّہ ذرّہ میں اُسی کا ظہور ہے تو ہر شئے کو چاہا جائے، اُس سے پیار کیا جائے۔ اسی لیے وہ صوفی سنتوں کا احترام کرتے تھے کہ ان کی بدولت انسانی معاشرے میں ایکتا، محبت اور پیار کے نغمے فضا میں بکھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

روشنی روح کی موقوف فنائے تن ہے
جلتے جب شمع کو دیکھا تو پگھلتے دیکھا
ایک عالم محو نظارہ ہے اور وہ پردہ دار
گر اسی کا نام ہے پردہ تو وہ پردہ کریں
دھوکے کا تعین بھی دھوکا نظر آتا ہے
تصویر سمجھتا ہوں، پردہ نظر آتا ہے
یہی ہستی، اسی ہستی کے کچھ ٹوٹے ہوئے رشتے
وگرنہ ایسا پردہ میرے اُن کے درمیاں کیا تھا

صفی پور اور گنج مراد آباد سے تعلق، حسرت دہانی اور ثاقب کانپوری کی قربت اور بچپن سے ہی اہل تصوف کی محفلوں میں شرکت کی بنا پر ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ آ گیا جو تخصیص و تمیز کے فرق کو مٹا دیتا ہے۔

رحمت تری بے حد ہے بخشش تری بے پایاں
منصور کو ہر قطرہ دریا نظر آتا ہے
بھلا ہنگامۂ دار و رسن کی کیا شکایت ہے
یونہی منصور کی قسمت میں تھا منصور ہو جانا
ذوق ادب میں ہر نفس سر بسجود ہے یہاں
فرق ہے شیخ کی نماز اور مری نماز میں

ہم نہ بت خانے کے بندے ہیں نہ کعبے کے مُرید
ہو جہاں نور حقیقت سر جھکانا چاہیے
تسبیح کے میں قرباں ، زنار کے میں صدقے
دونوں میں مگر مجھ کو پھندا نظر آتا ہے
جس طرح ہو روح کی مشکل کو آساں کیجئے
ختم بحثِ امتیازِ کفر و ایماں کیجئے

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کا مطالعہ کیجیے تو احساس ہوتا ہے کہ اس وقت انگریز آمریت کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا بھی شک ہونے پر مقدمہ قائم ہوجاتا تھا۔ طور طریق، اظہار بیان بلکہ غور وفکر کی بھی آزادی سلب ہو رہی تھی۔ ان حالات کا اثر غم وغصہ کی صورت میں اندر ہی اندر پیدا ہو رہا تھا جس کے اظہار کے لیے غزل کا رمزیہ اندازِ بیان سب سے بہتر طریقہ تھا۔ اس میں قفس، گلشن، گلستان، باغباں، صیاد، برق، آشیانہ، نشیمن، قاتل، جلاد، انصاف، دار و رسن وغیرہ انگریزی ظلم وستم سے منسوب تھے۔ رواں کے یہاں بھی یہ اندازا اپنے معاصرین کی طرح عیاں ہے۔

دیا جاتا ہے اب ظلم اسیری بے گناہوں کو
بھلا کچھ ایسے ظلم ناروا کی انتہا بھی ہے
اسیرانِ قفس اس زندگی سے موت بہتر ہے
گھٹا جاتا ہے دم اور کھل نہیں سکتی زباں میری
زمیں سے آسماں تک بھر دیا ہے جوش آزادی
اسیروں نے تمھارے جو کیا آزاد کیا کرتے
محافظ جان کے دشمن ہیں ابنائے وطن غافل
رلاتی ہے لہو یہ حالت ہندوستاں مجھ کو

غزل کے ان اشعار میں داخلی تسلسل کا جو احساس، نرمی اور گداز ہے وہ شاعر کی خلاقانہ قدرت اور تکنیکی مہارت پر دال ہے۔ لب و لہجہ میں بھی حلاوت کا عنصر غالب ہے۔

دل گم گشتہ کے ملنے کی صورت گر یہی ٹھہری
لیے آتے ہیں تھوڑی خاک ہم بھی کوئے قاتل سے
یہ امکان ترقی آج ہے دعویٰ خدائی کا
اُسی دل کو جو کل تک تھا لہو کی بُوند مشکل سے
گل و لالہ پر آخر کر رہا ہے غور کیا گُل چیں
وہی خوں ہے جو ٹپکا تھا کبھی چشم عنادل سے
الٰہی منزلِ مقصود تک کیوں کر میں پہنچوں گا
کہ تھک کر بیٹھ جاتا ہوں جو اُٹھتا بھی ہوں مشکل سے

تقدیر جب معاونِ تدبیر ہو گئی
مٹی پہ کی نگاہ تو اکسیر ہو گئی

کسی تدبیر سے جب جی نہ بہلتے دیکھا
آشیاں پھونک کے اپنا اُسے جلتے دیکھا

رواں کی غزلوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں طے شدہ، مقررہ اور مفروضہ تصورات کے بجائے حسن و عشق، ہجر و وصال، قربت و دُوری کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ طرفگی خیالات اور جدت ادا سے مالا مال غزلوں میں تنوع، تازگی اور اثر آفرینی ہے۔ افکار و نظریات کی بلندی کے ساتھ طبیعت کی شوخی، تخیل کی رنگینی، طرز ادا کی دلکشی رواں کی غزلوں کی اہم خصوصیات قرار دی جا سکتی ہیں۔

رُباعی گو

''رُباعی'' عربی زبان کا لفظ ہے اور رُباع سے مشتق ہے۔ فارسی میں اس کا رواج ساتویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ رودکی کے عہد سے اس کی ترویج ہوتی ہے اور عمر خیام اسے معراج کمال تک پہنچاتے ہیں۔ اردو زبان میں یہ صنف روزِ اوّل سے نظر آتی ہے۔ یہ فنِ شاعری کی وہ قسم ہے جس میں شاعر محض چار مصرعوں میں اپنا مدعا بیان کر دیتا ہے۔ پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع لازماً ہم قافیہ ہوتا ہے۔ عموماً تیسرا مصرع ہم قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کی گنجائش ہے کہ چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ پہلی شکل کو ''خصی'' اور دوسری کو ''غیر خصی'' کہتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس ہیئت میں لکھی ہوئی ہر تخلیق رُباعی ہی ہو کیونکہ اس کے لیے مخصوص اوزان کی شرط بھی ہے (جس کی پابندی کے بغیر اس ہیئت میں لکھی ہوئی تخلیق رُباعی کے بجائے قطعہ کے دائرے میں شمار کی جائے گی)۔ رباعی کے لیے چوبیس اوزان مقرر ہیں جو بحر ہزج سے حاصل کیے جاتے ہیں۔

حدائق البلاغت، بحر الفصاحت، معیار البلاغت اور جامع العروض میں چوبیس اوزان ہی کا ذکر ہے۔ ان چوبیس اوزان میں بارہ کا تعلق دائرہ اخرب اور بارہ کا تعلق دائرہ اخرم سے ہے۔ امیر الاسلام شرقی نے ایک نیا فارمولا دریافت کیا جس کے بارے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی ''تحقیق کی روشنی میں'' لکھتے ہیں:

> ''اہلِ عروض نے رُباعی کے اوزان کا استخراج بحرِ ہزج سے کیا ہے اور مسٹر شرقی نے ان اوزان کو بحرِ رجز سے نکالا ہے۔ بحرِ رجز کا اصل اور سالم رکن مستفعلن ہے..... مسٹر شرقی نے مستفعلن پر زحافوں کا عمل کر کے صرف یہ چار ارکان حاصل کیے:
>
> 1۔ فع 2۔ مفتعلن 3۔ مفاعلن 4۔ مفعولن۔'' (ص،393)

عام طور سے شاعر رُباعی کے تین مصرعوں میں تین الگ الگ باتیں کہتا ہے لیکن چوتھے مصرع

میں مذکورہ مصرعوں کا نچوڑ اس خوبی سے رکھتا ہے کہ قاری متحیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسے حاصلِ رُباعی کہتے ہیں۔ سید امداد امام اثرؔ رُباعی کے چوتھے مصرع کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چوتھا مصرع بہت پُر مضمون اور پُر زور ہو۔ ایسا گویا کہ ہر سہ مصرع ہائے کا خلاصہ یا نتیجہ ہو۔'' (کاشف الحقائق، جلد دوم، ص، 274)

مولانا احسن مارہروی اس بابت فرماتے ہیں:

''چاروں مصرعوں میں آخری مصرع رُباعی کی جان ہوتا ہے اور اسی کو زیادہ زوردار بنانے کے لیے تین مصرے بہم پہنچائے جاتے ہیں۔''

(دیباچہ کلیات ولی، ص، 76)

سرسید کے شاگردِ رشید مولانا وحید الدین سلیم رُباعی کے آخری مصرع کو سارے مضمون کا ما حصل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چوتھا مصرع خاص کر پہلے والے مصرعوں سے زیادہ شان دار اور اہم ہو۔ یہ مصرع ایسا ہونا چاہیے کہ سننے والے کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہے۔'' (افاداتِ سلیم، ص، 194)

مرزا فدا علی خنجر چوتھے مصرع کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''چوتھے مصرع میں روانی، برجستگی، اثر و سلاست اتنی ہونا چاہیے کہ متکلم کی زبان سے نکلتے ہی سننے والے کے دلوں میں اتر جائے اور مفہوم سمجھنے میں کوئی تکلف نہ ہو۔ کیوں کہ صرف ایک مصرع کی تشریح کے لیے قائل کو اوپر کے تینوں مصرعوں کو نوک پلک سے دُرست کر کے لانا پڑتا ہے، اور جب تک چاروں مصرعوں کی چول سے چول نہ بیٹھ جائے اسے کامیابی کا یقین نہیں ہوتا۔'' (رُباعیاتِ رشید، ص، 21)

عموماً جس فن کار نے رُباعی گو کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر لی ہو، اُسے بڑا شاعر کہنے میں نقاد ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں چونکہ اس میں کافی مشق اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے رُباعی گو سے مطالبات کا سلسلہ خاصا طویل ہے:

1۔ وہ عروض سے پوری طرح واقف ہو۔
2۔ شاعری کا ایک لمبا سفر طے کر چکا ہو۔
3۔ شعر گوئی پر پوری قدرت رکھتا ہو۔
4۔ تجربات و مشاہدات کافی وسیع ہوں۔
5۔ خیالات میں گہرائی اور پختگی ہو۔
6۔ زبان اور اظہار بیان پر مضبوط گرفت ہو۔

دراصل رُباعی مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ یہ ایجاز و اختصار کا فن ہے، اس میں عمیق فلسفیانہ خیالات، دقیق اخلاقی نکات اور نہایت پیچیدہ مسائل محض چار مصرعوں میں خوبی سے ادا کیے جاتے ہیں۔ بحر کی پیچیدگی اور عروضی قیود کی پابندی کی وجہ سے اسے اساتذہ کا کام کہا گیا ہے۔ تلوک چند محروم اس بابت لکھتے ہیں:

''رُباعی لکھنے کے لیے کافی مشق سخن اور پختگی عمر کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شاعر کی زندگی میں رُباعی نویسی کا دور آخر میں آتا ہے۔''

(مقدمہ رعنائیاں، ص، 40)

یہ شاعر کی فکر و نظر اور فہم و بصیرت کا بیش قیمت سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کا فن قلزم کو قطرے میں منتقل کرنے یا دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی:

''رُباعی ایک بہت بڑی بلا، اور جان لیوا صنفِ کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے پیش تر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں.........'' (مقدمہ قطرہ و قلزم، ص، 1)

رُباعی کی ڈگر کٹھن اور پُرخار ہے۔ اسی وجہ سے عموماً شعرا مذکورہ صنفِ سخن کی جانب کم توجہ دیتے ہیں۔ نومشق شعرا تو اس راہ میں گھبراتے بلکہ ناکام نظر آتے ہیں، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مشکلات کو آسان بنانے کا ہُنر جانتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رواں بھی اُن ہی میں سے ایک ہیں۔

چودھری جگت موہن لال رواں نے بیس سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ پچیس سال کی عمر میں وہ کامیاب رُباعی گو کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور پھر اپنی 45 سالہ زندگی میں آخر عمر تک رُباعی کہتے رہے۔ انھوں نے بیس پچیس سال کے ادبی سفر میں تقریباً ڈھائی سو رُباعیاں لکھیں جو خیال اور آہنگ کو نئی تازگی اور رعنائی بخشتی ہیں۔ ''تذکرہ شعرائے اتر پردیش'' حصہ دوم میں عرفان عباسی لکھتے ہیں:

> ''رواں صاحب نے زندگی کے مختلف پہلوؤں اور موضوعات پر لاتعداد رباعیات کہی ہیں جو سہل ممتنع، لطیف استعارات، نادر تشبیہات، تراکیب کی خوشنمائی اور بندش کی چُستی کے حُسن سے مالا مال ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صنف رُباعی کو موجودہ ممتاز حیثیت تک پہنچانے والوں میں رواں صاحب بھی ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔'' (ص،133)

رواں کے تینوں شعری مجموعوں میں رُباعیات موجود ہیں۔ 'رباعیاتِ رواں' تو محض رباعیات کا ہی مجموعہ ہے۔ ''روحِ رواں'' اور ''باقیاتِ رواں'' میں بھی یہ کثرت سے موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد اشفاق نے اپنے مقالہ میں ان کی تعداد 233 بتائی ہے۔ ''تاریخ ادب اردو'' کے مؤلفین نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ تاجور نجیب آبادی ''رباعیات رواں'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اگر جناب رواں کی کل ہند ادبی و شاعرانہ مرتبت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ مختصر مجموعہ ان کی شاعرانہ عظمتوں اور ان کی ادبی خدمات کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔'' (ص،10)

رواں، مولانا حسرت موہانی، پریم چند اور جلیل قدوائی کے قریبی دوست تھے۔ محب وطن چندر شیکھر آزاد کی دھرتی اناؤ میں اپنی پیدائش پر وہ فخر محسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ صوفی سنتوں کی اس جنم بھومی سے ہی حصولِ آزادی کے سپوت پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اس عہد کے بڑے شعرا اور ادیب ہی نہیں بلکہ حُریت پسند انقلابی بھی رواں کے گھر پر آتے اور کئی کئی دن قیام کرتے تھے، جس کا ذکر بھگوتی پرشاد مادھو کے مضامین، حسرت موہانی اور پریم چند کے خطوط میں ملتا ہے۔

کچہری اور کاشت کے کام کاج کے علاوہ رواں کا بیشتر وقت دوستوں کی طویل صحبت، انسانی فلاح و بہبود کے کاموں اور دوسروں کے دُکھ درد کو بانٹنے میں گزرتا تھا کیونکہ وہ بھی حسرت کی طرح غلام دیس کی موجودہ صورت حال سے مضطرب تھے۔ اضطراب کی ایک فن کارانہ جھلک ملاحظہ ہو۔

غم شہر بشہر پھیلتا جاتا ہے　　اللہ کا قہر پھیلتا جاتا ہے
اب تک تو دلوں میں اک حرارت تھی رواں　　اب خون میں زہر پھیلتا جاتا ہے

ایک جانب سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ آزادی کی تڑپ کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف دشمنوں کی چالبازی سے وہ بے چین اور وطن کی آزادی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

اس وقت ہو اپنی قوم شایانِ نبرد
جب ایک ہی جذبے سے ہوں مضطر زن و مرد
کُل قوم کے دل میں درد ہر فرد کا ہو
اور دل میں ہو فرد کے کل قوم کا درد

اس حساس اور نیک دل شاعر کی رُباعیوں میں قومی اور وطنی جذبے کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ ملک، قوم اور زبان و ادب کے لیے وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے کم عمری میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

یوں زیست نہ اپنی ہم کو بھاری ہوتی
کلفت بھی خوشی بھی باری باری ہوتی
ہوتے نہ اگر ہم آپ اپنے دشمن
یوں تلخ نہ زندگی ہماری ہوتی

جگت موہن لال رواں کی رباعیات کا مجموعہ اصغر گونڈوی کے مقدمہ کے ساتھ عطر چند کپور، لاہور نے شائع کیا جبکہ اِس سے پہلے موصوف کا مجموعۂ کلام 1928 میں ''روح رواں'' کے نام سے شائع ہو چکا تھا، اور اس کا طویل مقدمہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے لکھا تھا۔ باکمالانِ لکھنؤ میں عزیز کے مرتبے اور ان کے مجموعے ''گل کدہ'' سے کون واقف نہ ہوگا، عزیز لکھنوی وہ ہیں کہ جنھوں نے لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ایک نسل کی آبیاری کی ہے۔ اُن کا مبسوط مقدمہ اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ جگت موہن لال رواں اردو کے موقر شاعر تھے۔ انھوں نے رواں کی شاعری پر جو گفتگو کی ہے وہ اپنی صراحت و وضاحت میں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی یاد دلاتی ہے۔ لسان الہند کا یہ مقدمہ فرمائشی نہیں پھر اُس زمانے میں باطن اور ضمیر کی آواز آج کے مقابلے میں بہت زیادہ لائق اعتنا تھی۔

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے
دل بے پروا رہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعثِ قید رواں
محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

پروفیسر سید ابوالحسنات حقی، سید محمد علی شاہ اور سید ابوالبرکات نظمی نے جگت موہن لال رواں کے تعلق سے منعقدہ ایک اہم مذاکرے میں کہا کہ:

''فقیری اور آزادیٔ فکر و خیال لکھنے لکھانے والوں کا ایک عام اور بنیادی وصف تھا۔ مداح اور ممدوح دونوں ان ہی اخلاق و اوصاف سے بندھے

ہوئے تھے۔ خوبیوں کے سراہنے میں یہ نسل کوئی پہلو دبا کر نہیں رکھتی تھی۔
آج کے نقاد، پہلوانوں کے اس استاد (خلیفہ) کی طرح ہیں جو ایک داؤ
شاگرد سے بچا کر رکھتا تھا کہ پتہ نہیں کب شاگرد منہ آجائے۔ آپ دیکھیں
کہ مذکورہ بالا روش آج عام ہے، لیکن عزیز اور رواں ہی نہیں اس دور کا ہر
منتہی و مبتدی اس مرض سے دُور تھا۔ حرفِ حق دوستی و دشمنی کو مانع نہ
تھا۔۔۔۔ وہ کہ جس سے مختلف مسائل و معاملات پر اختلاف بھی ہوتا تھا
اس کے خوب صورت احساس وافکار پر خاموش رہنا اس عہد میں کفر اور خود
ستائی کی دلیل تھا۔ غالب کی دماغ داری اور خودستائی کے دفتر یاروں نے
سجا رکھے ہیں مگر وہ اعتراف کرتا ہے، ہے تو یہ کہ اب مجھے کچھ یاد نہیں اور
جو دو ڈھائی شعر یاد ہیں ان میں خود اس کا اپنا ایک مصرعہ بھی نہیں۔

''دام واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیز داب اللہ ہی اللہ ہے''

عزیز لکھنوی نے اپنے مقدمہ میں جس طرح رواں کے حُسنِ شاعری کو اُجاگر کیا ہے وہ خود اُن
کے ذوقِ سلیم اور ناقدانہ مزاج کے لیے ایک مستند حوالہ ہے۔ شاعری کے حسن کو محسوس کرنا اور اُس
سے لطف اندوز ہونا اچھی بات ہے اور یہ عطیہ خداوندی ہے، مگر اس سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں
اپنے محسوسات کو بیان کرنے پر قدرت بھی حاصل ہو۔ اظہار کی یہ دولت ہمیشہ کم یاب رہی ہے
لیکن مولانا عزیز میں یہ دولت فراوانی کے ساتھ موجود تھی اور انھوں نے اس دولت خداداد سے
خوب خوب کام لیا ہے۔ حقی صاحب کا کہنا ہے کہ ان اصحاب کا دامن کفرانِ نعمت کے عیب سے
پاک تھا۔ مرزا ہادی رسوا جو کہ مولانا عزیز کے بزرگ ہم عصر تھے اُن کی عالمانہ مثنوی کو منظرِ عام تک
لانے کا سہرا بھی عزیز لکھنوی کے سر ہے جسے 'زمانہ' کانپور، میں انھوں نے شرح وبسط کے ساتھ
شائع کیا، اس طرح ادب کی ایک بڑی خدمت انجام دی۔ لسان الہند کی اس خدمت سے پروفیسر

محمد حسن نے بھی فیض اُٹھایا اور اسے کتابی صورت دے دی۔

یہ ذکر ضمنی نہیں بلکہ رواں کے مقدمہ نگار کے اُن اوصاف کو منظرِ عام تک لاتا ہے جو اُن میں خلقی تھے۔ ایک بڑا شاعر جب اس طرح کی خدمت انجام دیتا ہے تو اس کا قد اور بلند ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا عزیز بحیثیت شاعر مرزا ہادی رسوا اور جگت موہن لال رواں دونوں سے بڑے شاعر تھے۔ مگر انھوں نے مذکورہ دونوں شاعروں کے محاسن شعری سے ہمیں یوں روشناس کیا ہے کہ محابا کا کوئی تسمہ باقی نہیں رکھا۔ آج ہمارے پاس صلاحیتوں کی کمی نہیں، مگر ہم یہ سب کچھ کر گزرنے سے محض اندیشوں (غلط اندیشوں) کے سبب پہلو بچاتے رہتے ہیں اور ہماری سوچ یہی سوچتی رہتی ہے کہ۔

فریب دوستی روز اک نیا پیکر بدلتا ہے
خدا جانے ہمارے ہاتھ میں کل کس کا دامن ہو

اپنے طویل مقدمے میں عزیز نے رواں کی غزلوں اور رُباعیات سے الگ الگ بحث کی ہے اور ہر مبحث کا حق ادا کر دیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے اس مجموعہ کلام میں پہلے کچھ نظمیں ہیں، ترجمے ہیں، یعنی انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے۔ مقدمہ نگار نے رواں کی نظم نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رواں نے شاعری کی ابتدا موضوعاتی نظموں سے کی تھی۔ قابل مقدمہ نگار کا مندرجہ ذیل اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ''ابتدائی زمانے کی بعض نظمیں مصنف نے خارج کر دیں۔ لیکن پھر بھی 1902 سے دسمبر 1926 تک کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ اس میں بھی اکثر نظمیں حذف کر دینے کے قابل تھیں کیونکہ کوئی خاص خصوصیت ان میں نہیں بلکہ اکثر خامیاں بھی موجود ہیں جن پر خود مصنف نے بھی نظر ثانی نہیں کی، صرف اس خیال سے کہ کلام کا تدریجی ارتقا معلوم ہو جائے۔'' (ص، 18)

تبصرہ و انتقاد کا یہ انداز اب کہاں؟ حقائق کی معرفت کا یہ قرینہ ہم بزرگوں ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے اغلاط کا علم کرانے والے زہر ہی لگتے ہیں۔ جہاں حسن و قبح کا اظہار برملا ہو ایسی تحریروں کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اب تو صرف دو صورتیں ہی نظر آتی ہیں یا تو سب کچھ بہتر یا سب لائق گردن زدنی۔ عزیز لکھنوی نے رواں کی غزلوں پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے روح کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کام اس لیے بھی لائق ستائش ہے کہ اس طرح بے کد و کاوش ہمیں قیمتی اشعار کا انتخاب حاصل ہو جاتا ہے اور یہ انتخاب بھی لسان الہند کے ہاتھوں ہوا ہے۔ مذکورۂ بالا گفتگو سے قطع نظر معروف رُباعی گو جگت موہن لال رواں کی چند رُباعیات ملاحظہ ہوں۔

فطرت کہتی ہے ظلمتوں کے پس پشت
کیا ہو باران نور اگر ہو یک مشت
ہنگامۂ طور کر رہی ہے برپا
صبح خنداں کی اک حنائی انگشت

شاعر نے ہنگامۂ طور کی تلمیح کا سہارا لے کر رُباعی کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہ رُباعی علی الصباح کے منظر کی بے پناہ دلکش تصویر ہے۔ آفتاب کی پہلی کرن کے لیے صبح درخشاں کو حنائی انگشت کا استعارہ کس قدر حسین بنا دیا ہے گویا ایک معشوق از راہ شوخی انگشتِ حنائی بلند کر کے عاشقوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ اس کے تلقین کرنے کا یہ دل رُبا انداز دیکھ کر فطرت کی ہر شے گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ جب ایک انگشتِ حنائی (سورج کی کرن) کے نظارے نے کوہِ طور کو جلا کر خاک کر دیا تو اُس وقت تو شاید قیامت ہی برپا ہو جائے جب شاہ خاور (آفتاب) یکا یک نظروں کے سامنے آ جائے۔ وسیع معنوں کی حامل اس رُباعی کے پہلے مصرع سے صبح کا دُھندلکا مترشح ہے۔ دوسرے میں ظلمت کی پوری تاریخ پوشیدہ ہے۔ تیسرا فطرت کے حُسن کی عکاسی کرتا ہے اور چوتھا مصرع حاصل رُباعی ہے کہ تمام فطرت تاریکی سے بیزار ہو کر ظہورِ صبح کا انتظار کر رہی ہے۔

اس کا اشتیاق اور اضطراب بڑھتا جارہا ہے۔ اس کے صبر کا پیانہ لبریز ہونے کو ہے کہ اُفقِ مشرق سے صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتی ہے اور قلب عارف کے سرور اور وجدان کو دو چند کر دیتی ہے۔ تاریکی سے روشنی کے سفر اور پھر پہلی کرن سے سورج کے مکمل طلوع ہونے تک کی کیفیت کے فاصلہ کو جگت موہن لال رواں نے جس موثر انداز میں بیان کیا ہے وہ فطرت کی حسین عکاسی کی عمدہ مثال ہے۔

فنا و بقا کے فلسفہ کو رُباعی کے موضوعات میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ جگت موہن لال رواں نے بھی زندگی کی حقیقت اور ماحصل زندگی کو موضوع بنایا ہے۔

اس دار فنا میں مقصد دل کیا ہے
کہیے تعبیر خواب باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی
آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

شاعر کو تعجب ہے کہ اس دنیا کا اور میری ہستی کا منشا کیا ہے؟ وجود عالمِ امکان اور وجود بشر کو عام انسانی ذہن نہیں سمجھ سکتا اس لیے رواں بے چین اور مضمحل نظر آتا ہے۔ کہتا ہے دل کو جب لمحہ بھر سکون نہیں، کسی پل قرار نہیں تو پھر اس زندگی کا لطف کیا ہے، مقصد کیا ہے؟ یہ راز اس پر منکشف نہ ہو سکا، اور وہ اسی سلسلۂ علت و معلول پر شکوہ کرتا ہے کہ جب خالق کائنات کو یہ دنیا ویران کرنی تھی، فنا کرنی تھی تو پھر اسے بنانے، سنوارنے کی ضرورت کیا تھی (اس مقام پر اگر رواں اسلامی فکر سے بھرپور استفادہ کر لیتے تو پھر گوں مگوں کی حالت نہ رہتی) اس پر کچھ اسرار منکشف ہوتے ہیں وہ کہہ اُٹھتا ہے۔

دنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے
سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکر فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں
کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

زندگی کا مقصود دنیا نہیں مگر دنیا ہے کہ طرح طرح کی حسین اور خوب صورت اشیا، دل فریب اور دل رُبا مناظر سے بھری ہوئی ہے اور انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر انجام پر نظر رکھنے والا دل کہتا ہے کہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے تو تُو کیوں فریفتہ ہوتا ہے۔ ناپائیدار اور فنا ہونے والی شے میں سوا تکلیف اور کچھ نہیں ہوتا۔

دل ! مائل گریہ کے لیے ہوتا ہے
کیوں بے سبب آنسوؤں سے منھ دھوتا ہے
لا حل نہیں عُقدہ صعوباتِ جہاں
جب موت یقینی ہے تو کیوں روتا ہے

یہ رُباعی جدّتِ خیال کی اچھوتی مثال ہے۔ رواں نے اس میں عبرت اور نصیحت کے ساتھ شکایت زمانہ اور رو برائی دل کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

صوفیا کرام نے قربت، محبت، یگانگت اور انسانی عظمت کا راز نفس پر قابو پانے کو قرار دیا ہے لیکن چند روزہ زندگی کی چمک دمک اور نام و نمود کی نمائش اُسے ہر پل تگ و دو میں مصروف رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیاوی ہوس اُسے مرکر بھی چین نہیں لینے دیتی ہے۔

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی
اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں
مرکر بھی اُمید زندگانی نہ گئی

انسان کس قدر حریصِ زندگی ہے کہ مرنے کے بعد بھی آرزوئے زیست باقی رکھتا ہے۔ جب مزار پر نام کندہ کیا جا رہا ہے، پتھر لگایا جا رہا ہے تو گویا اب بھی دنیا میں رہنے کی تمنا باقی ہے۔ حالانکہ جب خاک ہوگئے تو پھر اس کی ضرورت کیا تھی۔ شاعر نے مذکورہ رُباعی میں اس فلسفیانہ نکتہ کو اُجاگر کیا ہے کہ چونکہ انسان موت کو منافی حیات سمجھتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ غور طلب مسئلہ

ہے کہ اصل منشائے زندگی کیا ہے؟ آخر اس دنیا اور ہستیِ دنیا کا انجام کیا ہے؟ یہی نا کہ اپنے اصل مرکز کی طرف واپس جانا۔ اگر یہ راز انسان کی سمجھ میں آجائے تو وہ موت سے بے تعلق ہو جائے اور پھر یہ زندگی کا درخت اس طرح لہلہاتا ہوا پروان چڑھتا رہے کہ اس کو کبھی خزاں کا اندیشہ ہی نہ رہے۔

کیوں کر فکر کریں کہ حکم مولا کیا ہے
دنیا کیا ہے مآلِ دنیا کیا ہے
سر گرم عمل ہیں تا بہ امکانِ عمل
اس سے بے فکر ہیں نتیجا کیا ہے

زندگی کو سنوارنے اور مستقبل کو خوشگوار بنانے کی لگن عملی زندگی کو متحرک بناتی ہے مگر اس تگ و دو میں اگر انسانی اقدار مجروح ہوں تو سب کچھ لا حاصل ہے۔ رواں اخلاقیات کے اس درس کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ، منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔

فکر رزق و معاش اے دل کیا ہے
یہ کس کو خبر کلید منزل کیا ہے
دانہ دانہ پہ جب کہ ہے مہر رواں
اس کاوش بے محل کا حاصل کیا ہے

زندگی اور موت کی کشمکش اور ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا انسان کو ''آبِ حیات'' کی تلاش میں سرگرداں کر دیتی ہے اور وہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ حیاتِ ابدی کس طرح حاصل ہو جبکہ شاعر اس بات کو اُجاگر کرتا ہے کہ زندگی اور موت دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جسے ہم اجل سمجھتے ہیں وہی اصل اور حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ لہٰذا موت سے گھبرانے کی ضرورت ہی نہیں۔

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے

اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواں
یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

انسان دو چیزوں کے درمیان معلق ہے۔ زندگی اور موت۔ بنا زندگی اور مقصد زندگی سمجھے موت کے معنی نہیں سمجھے جا سکتے۔ جس طرح اگر انسان موت کے خوف میں مبتلا رہے گا تو زندگی دشوار تر ہوتی جائے گی۔ لہٰذا رواں کہتے ہیں کہ پہلے زندگی اور جہانِ فانی کو سمجھو پھر بعدالموت عقبیٰ کا صحیح صحیح عقدہ سمجھ میں آ سکے گا۔

زندگی کی دو متضاد کیفیتوں یعنی فنا اور بقا کو رواں نے اپنی اکثر رُباعیوں میں پیش کیا ہے۔

تخریبِ حیات میں ہے تعمیرِ حیات
ہے باعثِ انحطاط تدبیرِ حیات
شیرازۂ دو جہاں ہے تشریحِ فنا
کڑیاں لاکھوں ہیں ایک زنجیرِ حیات

شاعر کہتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے مقصد کی تکمیل کرتا ہے اور ہم پر عالم کے یہ تمام تغیرات ظاہر ہیں سبھی کی ایک دوسرے سے کڑیاں ملی ہوئی ہیں کہ جیسے نیکی بدی کا اور بدی نیکی کا پیش خیمہ ہے۔ خزاں بہار کی اطلاع دیتی ہے اور بہار پیغام خزاں ہے یعنی ملن اور جدائی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ صورتیں بدلتی رہتی ہیں البتہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ اُس کے اجزائے حیات منتشر ہو کر بھی متحد رہتے ہیں اور یہی فلسفۂ حیات ہے۔ اسی خیال کو انھوں نے ایک اور رُباعی میں بڑے اچھوتے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا ، جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

زندگی لمحہ بہ لمحہ تمام ہوتی رہتی ہے جس طرح بقول فانی "ہر نفس عہدِ گذشتہ کی ہے میت فانی" تو رواں کو یہ احساس بخوبی ہے کہ زندگی فنا کی طرف گامزن ہے مگر افسوس اس امر پر ہے کہ یہ عمل بہت تیز ہے۔ وہ بچپن اور جوانی کو پیار سے یاد کرتے ہیں۔ بچپن کو پھول کی مہک اور جوانی کو ہوا کا جھونکا کہا اور مکمل زندگی کو موجِ دریا سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نہایت حسین دل پذیر تشبیہات ہیں جن سے رواں کی بلند خیالی کا پتا چلتا ہے۔

اکثر شعرا نے "انسانی عمل" کو موضوع بناتے ہوئے مختلف تاویلات کے ذریعہ اسے الگ الگ ڈھنگ سے پیش کیا ہے رواں لکھتے ہیں۔

ہر یاس کو مدعا سمجھتے ہیں ہم
ہر قطرہ کو اک دریا سمجھتے ہیں ہم
کیسا بت خانہ اور کعبہ کیسا
ہر ذرّہ کو جب خدا سمجھتے ہیں ہم

انسانی عقل یہ راز جاننے سے قاصر ہے کہ اس کا کون سا عمل بارگاہِ خداوندی میں قبول ہوگا اور کون سا عمل اس کی ناراضگی کا سبب بنے گا۔

توصیف صفت کسی کو معلوم نہیں
اس کی غایت کسی کو معلوم نہیں
عالم ہے اسیر دام نیرنگ نمود
اصلی حالت کسی کو معلوم نہیں

اسی طرزِ فکر کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

دنیا کی صفت کسی کو معلوم نہیں
قدر نعمت کسی کو معلوم نہیں
دوزخ تو ہزاروں دیکھتے ہیں لیکن
حال جنت کسی کو معلوم نہیں

رواں اسی کشمکش میں بھی مبتلا ہیں اور مندرجہ ذیل رُباعی میں اپنی فکر، درد اور معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

انسان معذور فکر انساں معذور
یہ کس کو خبر کہ کیا ہے اُس کو منظور
پیمانہ بدست رند اور اس سے قریب
تسبیح بدست واعظ اور اُس سے دور

لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ رُباعی نہ صرف بندش بلکہ بلندیٔ فکر اور فصاحت کا بہترین نمونہ ہے بلکہ بہ اعتبارِ فکر بہترین رُباعی قرار دی جا سکتی ہے۔ حالانکہ شاعر نے اس میں ایک عام سا قول قلمبند کیا ہے کہ تمام عمر عبادت و ریاضت میں صرف کرنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ سجدے قبول بھی ہوئے کہ نہیں کیونکہ کبھی کبھی ایک نعرۂ مستانہ بھی اس کے تقرب کے لیے کافی ہوتا ہے۔ رازِ عبادت کو دائرۂ کار میں لاتے ہوئے شاعر تلقین کرتا ہے کہ سب سے پہلے دل میں انسانی عظمت اور خوفِ خداوندی پیدا ہونا چاہیے۔ محض دکھاوے کی عبادت بے سود ہے۔

انجام کی فکر ہو شریعت یہ ہے
جان صرفِ وفا رہے ریاضت یہ ہے
زاہد سے کہو، نماز روزہ بے سود
دل خوفِ خدا کرے عبادت یہ ہے

اسی طرح اُن کی ایک اور اخلاقی رُباعی فصاحت اور زورِ بیان کی وجہ سے بے حد مشہور ہے۔

غربت اچھی نہ جاہ و دولت اچھی
حاصل جس سے دل کو ہو راحت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس نا ممکن ہو
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

اخلاق وحکمت کے موضوع پر رواں نے کثرت سے رُباعیاں لکھی ہیں جن میں نصیحتوں کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ باریکیاں بھی بیان کی ہیں۔ لوٹ پھیر کر شاعر نے فقیری کو ضمیر کی آزادی اور امیری کو دل کا استغنا ٹھہرایا ہے اور مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسیری خیالات کی حد بندی ہے اور جب تک خیالات آزاد ہیں، طوق وسلاسل کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ اصل میں خیالات کی تجدید ہی امیری اور وسعتِ خیال آزادی ہے۔ صاف ستھرے اور عام فہم انداز میں انھوں نے پند و نصائح کے لیے اکثر ساقی، جام اور مے نوشی جیسی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے۔

مطلوب ہے زخم دل جو سیتے نہ بنے
جینا کس کام کا جو جیتے نہ بنے
ہے مجھ کو حلال ہی نہیں بلکہ ثواب
مے اُس پہ حرام جس سے پیتے نہ بنے

شاعر کہتا ہے کہ یہ مے نوشی اگر حکیمانہ اصول وآداب کے موافق ہے تو مجھ پر حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ چونکہ شاعری میں شراب سے مراد ہر جگہ بادہ نوشی نہیں ہے بلکہ وہ حقائق ومعارف کی گفتگو کا اظہار بھی ہے۔ رواں نے اپنی سرمستی کا اظہار اس رُباعی میں عجب دلکش انداز سے کیا ہے جس میں زخمِ دل اور زندگی کو بظاہر رندیت کے موقف سے دیکھا گیا ہے لیکن اس میں ایک لطیف ظرافت کے پیرایہ میں معنویت بھی موجزن ہے۔ اِس کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ مشکل گھڑی میں بندہ، اللہ کی جانب راغب ہوتا ہے اور سکون میسّر ہوتے ہی پھر دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جب کوئی دیگر مشکل درپیش ہوتی ہے تو پھر اپنے رب کی جانب راغب ہوتا ہے۔ یہ دوطرفہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ وہ مزید کہتا ہے کہ اللہ کی رضا کے مطابق کام کرنا ایک نشہ کی طرح ہے جب یہ دنیاوی کام اُس کی مرضی کے عین مطابق کیے جاتے ہیں تو وہ صرف حلال ہی نہیں بلکہ ثواب ہیں اور یہ نشہ یہ سروران لوگوں پر حرام ہے جنھیں یہ مئے معارفت پینے کا سلیقہ نہیں ہے یعنی جو اللہ کے احکام کی روح سے واقف نہیں ہیں۔ اسی موضوع پر ان کی ایک اور مشہور رُباعی ہے۔

نو روز ہے غرق بادہ دنیا کردے
میرا ارمان آج پورا کردے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی
تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کردے

کے تمام خار زار چمنستان میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ترقی کی منزلیں کتنی جلد از جلد طے ہو رہی ہیں۔ اور پھر خیال کی آزادی نے تو اور بھی جلا بخشی ہے۔

رواں کے قطعات نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ روایت اور نئے پن کے احساس کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ بیان اور قوتِ اظہار ملاحظہ ہو۔

آپ تیار ہیں کرنے کو ہر اک پر احساں
شرط یہ ہے کہ کوئی آپ کا نقصان نہ ہو
مجھ کو رحم آتا ہے اس عہد کے نیکوں پہ رواں
اتنا گمراہ وفا بھی کوئی انسان نہ ہو

آدمی احسان کرنے کو تیار تو ہے مگر اس شرط پر کہ اس کا کوئی نقصان نہ ہو۔ تحفظ اور عدم تحفظ کی کشاکش ہی انسانی فطرت و جبلت ہے۔ لوگ اس سوچ کے ساتھ دوسروں کے کام آنا چاہتے ہیں کہ احسان کا احسان بھی ہو جائے اور ہمیں کچھ کرنا بھی نہ پڑے، ہمارا کوئی نقصان بھی نہ ہو۔ ایسی سوچ کے ساتھ نیکی کرنے والوں کے لیے رواں انحراف کی تاکید بلکہ تنبیہہ کرتے ہیں مگر رعایت لفظی کے ساتھ۔ انھوں نے اپنے قطعات میں مختلف صنعتوں کو تصرف میں لیا ہے مگر کس سادگی سے کہ قاری عش عش کر جائے۔

لٹ گیا اسباب عشرت پُرخطر ہیں منزلیں
اے گرفتارِ غلامی دیکھ اب تو سر اٹھا
اُف میری غفلت کہ اب بھی محوِ آسائش ہوں میں
بزمِ ہستی سے یہ آتی ہے صدا بستر اٹھا

عیش ونشاط کا سب سامان ختم ہو چکا ہے اور آگے کی منزلیں خطرے میں ہیں۔ اے نادان تو کتنا غافل ہے کہ آسائشوں میں اب بھی ڈوبا ہوا ہے جبکہ زندگی ختم ہونے پر ہے۔ کیا تجھے دستک کی صاف صدا سنائی نہیں دے رہی ہے کہ اب اپنا بستر اٹھا، یہ چل چلاؤ کا وقت ہے۔ کہا جاتا ہے دُکھ سُکھ، نشیب وفراز، بلندی اور پستی یہ سب زندگی کے مختلف رُوپ ہیں کیونکہ زندگی دُھوپ چھاؤں کی مانند ہوتی ہے اور شاعر اسی سے متاثر ہوکر اپنی شاعری کو پروان چڑھاتا ہے اور نئے نئے اشعار خلق کرتا ہے۔ رواں نے اس پس منظر میں انسانی خواہشات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

ہوس ہی آدمی کی دشمنِ اقبال و ایماں ہے
ہوس ہی سے یہ خارستان دنیا اک گلستاں ہے
یہیں پر آرزوئیں دفن ہیں اور حسرتیں زندہ
ہمارے دل کی بستی عالمِ گورِ غریباں ہے

ہوس اور لالچ آدمی کی قسمت اور ایمان کی دشمن ہے۔ اس کی تمناؤں میں ڈوبے لوگوں کو ہی یہ کانٹوں سے بھری دنیا گلستاں نظر آتی ہے۔ حالانکہ دنیا ہی وہ جگہ ہے جہاں سب آرزوئیں دفن ہو جاتی ہیں۔ صرف حسرتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ شاعر حسین استعاروں کے توسط سے کہتا ہے کہ ہمارے دل کی دنیا تو غریب کی قبر کی مانند ہے۔ جہاں حسرت وآرزو کے سوا کچھ نہیں۔

رواں اپنے عہد سے پوری طرح جُڑے ہوئے تھے۔ حساس دل کے ساتھ دوربین نظر کے بھی مالک تھے۔ ملک کی موجودہ حالت سے بیزار اور مستقبل کے حسین تصور کے دلدادہ تھے۔ اس کشمکش اور اضطراب کی یہ تصویر ملاحظہ ہو۔

دماغ ملک کا احساس گر بیدار ہو جائے
قرینِ مصلحت ہر غافل و ہشیار ہو جائے
پھنسی ہے آکے گردابِ فنا میں قوم کی کشتی
کوئی تدبیر کر یارب کہ بیڑا پار ہو جائے

اگر ہم وطنوں کا احساس بیدار ہو جائے اور مصلحتاً ہی ہر غافل جاگ جائے تو ہندوستان کا منظر نامہ بدل سکتا ہے۔ وہ افسوس کرتے ہیں کہ ہماری قوم غفلت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے جس کی وجہ سے تباہی اور بربادی کے بادل گھرتے جا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں قوم کو بغض وعناد سے گریز کرتے ہوئے کوئی ایسی تدبیر سوچنی چاہیے جس سے وہ پسپائی سے ابھر سکیں۔

زندگی میں مختلف قسم کی کشا کش کا احساس جس قدر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ابھرا تھا، شاید پہلے نہیں ہوا تھا۔ مشینوں نے انسانوں کی جگہ لینا شروع کی تو ایک اور کرب ابھرا، ایسے میں حقیقت اور تخیل نے اور بھی شدت اختیار کی۔ شاعر اس طرف بھی حسّاس ذہن کو ملتفت کرتا ہے۔

جہانِ عشق میں بیہوشیوں کی انتہا جو ہے
وہیں سے عالمِ عقل و خرد کی ابتدا سمجھو
علاجِ درد کا جب تک دل غافل رہے طالب
وہی حد ہے کہ جب تک تم مرض کو لا دوا سمجھو

عشق کی دنیا میں ہر کوئی اپنے ہوش وحواس کھو دیتا ہے۔ تخیل کی وادیوں میں گم رہتے ہوئے جنون کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہیں سے عقل کی ابتدا ہوتی ہے جب تک یہ غافل دل اپنے درد کے علاج کا طالب اور اسے لا علاج سمجھتا رہے گا عافیت میں رہے گا۔ دراصل یہ غفلت ہی اس کی عقل مندی ہے۔

عدم تحفظ، بے قدری، غلامی، اُداسی، بیگانگی، الجھن اور اُکتاہٹ جیسے منظر میں بھی وہ رومان کی دلکشی تلاش کر لیتے ہیں اور پھر حسّی جذبات اور اقدار کی کشا کش کو اُس میں تحلیل کر دیتے ہیں۔ حسیاتی اور جذباتی سطح پر عمل اور ردِ عمل کی بھی فراوانی اور رنگا رنگی ان کے اکثر قطعات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

مری قسمت مری دنیا کو زنداں کر کے چھوڑے گی
یہ ہر اک پھول کو خارِ مغیلاں کر کے چھوڑے گی

کہاں وہ حسن معصوم اور کہاں تر دامنی دل کی
مری ہمت مجھے اک دن پشیماں کر کے چھوڑے گی

رباعیات کی طرح رواں کے قطعات میں بھی بناوٹ اور روایتی شعر سازی سے گریز نظر آتا ہے تاہم زندگی کی تلخ حقیقتوں کی بھرپور پرچھائیاں مختلف انداز میں جلوہ گر ہیں۔

مجھے اکسیر میری آہ سوزاں کر کے چھوڑے گی
قناعت میری دردِ دل کو درماں کر کے چھوڑے گی
تہیہ ہے کہ اب یا میں رہوں یا کفر کمزوری
عقیدت ورنہ بے دینی کو ایماں کر کے چھوڑے گی

شاعر اپنی قسمت کی خرابی کا ذکر المیاتی انداز میں کر رہا ہے، اس اعتراف کے ساتھ کہ شاید اسی وجہ سے یہ دنیا اس کے لیے ایک زنداں کے مماثل ہوگئی ہے۔ ایسی صورت میں ہر ایک پھول اس کے لیے ببول کا کانٹا بن گیا ہے۔ وہ خود ہی فیصلہ کر رہا ہے کہ کہاں معشوق کا معصوم حسن اور کہاں میرا گنہ گار دل، ایسا نہ ہو کہ میرا عزم و حوصلہ کہیں مجھے شرمندہ کر کے نہ چھوڑے!

قطعہ نگار

رواں کے قطعات میں خلش و اضطراب بھی ہے اور سرخوشی و انبساط بھی۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ باہم جذبات کی پیش کش میں کشمکش یا تناؤ نظر نہیں آتا ہے۔

میں ان کے ظلم پر فریاد کیا اف تک نہیں کرتا
وہ ناداں ہیں جو اس کو میری کمزوری سمجھتے ہیں
جفا پر فخر ان کو ہے وفا پر اپنی میں نازاں
وہ اپنی کامیابی فتح ہم اپنی سمجھتے ہیں

قطعات کے ضمن میں اُن کے یہاں ایسی تخلیقات بھی شامل ہوگئی ہیں جو اپنی ہیئت کے لحاظ

سے پوری طرح قطع کے دائرے میں نہیں آسکتیں۔ مثلاً

جواہر میں محبت راستی انصاف یہ مانا
مآل زندگی ان سب کو بتلاتا ہے ہر دانا
مگر اے حضرتِ ناصح عجب کافر مرا دل ہے
یہ کہتا ہے کہ حکم آسان ہے تعمیل مشکل ہے

یہ تسلیم کہ محبت، سچائی اور انصاف قیمتی شے ہیں اور زندگی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انہی کی طرف لوٹ کر بھی جانا ہے۔ لہٰذا گوشۂ عافیت کے اس مرکز کو فراموش کرنا مناسب نہیں۔ زندگی میں سب کو اسی سے دو چار ہونا ہے۔ میں بھی رجوع کرتا ہوں مگر اے ناصح میرا دل راغب نہیں ہوتا، صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ کہ کہنا تو آسان ہے مگر اس کی تکمیل بہت مشکل ہے۔ بلاشبہ سچائی اور ایمانداری کے راستے پر چلنا، ہر ایک سے محبت کرنا، یہ جوہر انسانی تو ہیں، مگر ان پر قائم رہنا بہت دشوار ہے۔

جگت موہن لال رواں کا ایک اہم وصف سہل ممتنع بھی ہے حالانکہ سہل کہنا اور شعریت پیدا کرنا بڑا دشوار عمل ہے لیکن رواں نے زبان و بیان کی سادگی اور روانی کو ارفع خیالات کے ساتھ نبھایا ہے۔

میں جو کہتا ہوں کہ موت آئے تو مرجانے دو
اس تخیل کی حقیقت مجھے بتلانے دو
اصل یہ ہے کہ مرا دل ہے غمِ دہر سے چُور
اور اتنا کہ نہیں اب مجھے جینا منظور
دوسرے کوششِ ضائع سے ہوں ایسا مایوس
کہ کسی کام میں راحت نہیں ہوتی محسوس
تیرے فیصلہ پہ اب مرا ایمان ہے
موت بہتر ہے کہ انجام ہر انسان کا ہے

دل کو چھو لینے والا نظم کا یہ استفہامیہ انداز ملاحظہ ہو کہ کیا میری درد بھری آہیں اور میری قناعت، دردِ دل کا علاج ہے؟ یا دھوکہ یا یہ میری قوت ہے یا کہ کمزوری۔ کیونکہ مجھے اس تناؤ اور کشمکش بھری صورت میں سکون نہیں کیونکہ محبوب کے ظلم کے خلاف، فریاد تو کجا میں اُف تک نہیں کر سکتا اور جو ایسا کرتے ہیں وہ نادان، ناسمجھ ہیں کہ میرے کچھ نہ بولنے کو میری کمزوری سمجھتے ہیں۔ اُن کو اپنی بے وفائی پر فخر ہے تو میں اپنی وفا پر ناز کرتا ہوں۔ جس بات کو وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں اس کو میں اپنی فتح سمجھتا ہوں۔

رواں کے یہاں تشبیہات واستعارات کی نزاکت وندرت اور انھیں ترتیب دینے کا جو سلیقہ ہے، لفظ ومعنی کا ارتباط اور مضمون باندھنے کا جو دلآویز انداز ہے، وہ فن کار کی تخلیقی قوت کے ساتھ لسانی ترتیب کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے قطعات میں جہاں فکر کی پختگی نمایاں ہے وہیں ترکیبیں اچھوتی اور معنویت کی حامل ہیں بلکہ بڑے قرینے کے ساتھ برتی گئی ہیں۔ یہ قطعات تاریخی وتہذیبی بصیرت اور متنوع مشاہدات کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ واقعات کے بیان کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان میں معنی ومفاہیم کی ایک دنیا آباد ہے۔

مثنوی نگار

مثنوی لفظ ''مثنیٰ'' سے ماخوذ ہے۔ اس کے لغوی معنی ثانی، دوسرا، جُفت، جوڑا جوڑا کے ہیں۔ دو دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے بھی اس کا نام مثنوی پڑ گیا ہے۔ یہ بیانیہ نظم کی وہ ساخت ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کے بعد قافیہ بدلتا ہے اور تمام اشعار مجموعی طور پر مربوط ہوتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے قافیہ کی پابندی سے آزاد اس صنف کا ہر شعر دوسرے شعر سے ربط رکھتا ہے بلکہ واقعات سے منسلک ہوتا ہے گویا یہ ایک مسلسل نظم ہے اور تسلسل اس کی خصوصیت ہے۔

مثنوی کی ہیئتی ساخت میں قصہ کا التزام ضروری ہے۔ روایتی طور پر حمد، نعت، منقبت سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ حاکمِ وقت کی ستائش، محبوب کی توصیف، شعر وسخن کی تعریف کے بعد شاعر

نفسِ قصہ پر تمام توجہ مرکوز کرتے ہوئے حیرت واستعجاب کی تمام گتھیوں کو سلجھاتا ہوا قصہ کا با مقصد اختتام کرتا ہے حالانکہ ان روایتی پابندیوں سے انحراف بھی برتا گیا ہے مگر حاوی موضوع اور اس کا نظامِ عمل کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ مثنویوں میں محبت، نفرت، غصہ، حقارت، خوشی وغم کے جذبات فن کارانہ طور پر منعکس ہوئے ہیں۔ مناظر کا بیان سحر انگیز کیفیت پیدا کرتا ہے۔ سر سے پاؤں تک، ہر عضو کی تعریف کا خصوصی ذکر ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اس ہنرمندی سے بیان کی جاتی ہیں کہ جیسے فوٹوگرافی کی جا رہی ہے۔ مثنوی کا شاعر ان تمام باریکیوں کا خیال رکھتا ہے تاہم واقعہ نگاری اور تسلسلِ بیان مثنوی کی امتیازی صفت ہے۔

روزِ اول سے رزمیہ اور بزمیہ دونوں طرح کی مثنویوں کی دھوم رہی ہے۔ مذہبی اعتبار سے دیکھیں تو قدیم مثنویوں میں مختار کی معراج نامہ اور سیوک کی جنگ نامہ محمد حنیف مشہور ہوئی ہیں۔ تاریخی حیثیت سے نصرتی کی علی نامہ اور فتح نامہ ٹیپو سلطان۔ تصوفانہ نقطۂ نظر سے خوب محمد چشتی کی ''خوب ترنگ'' اور میراں جی شمس العشاق کی ''خوش نامہ''۔ میرے عہد سے مثنوی کا مزاج بدلا ہے۔ اس صنفِ ادب کے لیے جو سات چھوٹی بحریں مقبول تھیں، ان میں بھی ردّ وبدل ہوئی۔ رزمیہ کے لیے بحر متقارب اور بزمیہ کے لیے بحر ہزج اور بحر سریع خاص طور سے استعمال ہوئی ہیں۔ مولوی حکیم محمد عبدالغنی جی نے بحر الفصاحت میں بحور سے متعلق تفصیل بیان کی ہے۔ مقبول اور مروج بحروں کے علاوہ دیگر بحروں میں بھی مثنویاں کہی گئی ہیں۔ اس صنف کا دائرہ روزِ اول سے وسیع رہا ہے۔ اس میں عشقیہ، صوفیانہ، فلسفیانہ، اخلاقی، سیاسی غرض ہر قسم کے مضامین، مختلف زاویوں سے بیان کیے گئے ہیں۔ ''مقدمہ شعروشاعری'' میں الطاف حسین حالی رقم طراز ہیں:

> ''اردو شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ کارآمد یہی صنف ہے کیونکہ غزل یا قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک ایک قافیے کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی ہے۔ مثنوی میں ظاہری اور معنوی اعتبار سے بلند پایہ شاعری کے تمام

لوازم موجود ہیں۔"

شبلی نعمانی "شعرالعجم" میں لکھتے ہیں:

"انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیل۔ ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا...... مناظرِ قدرت، بہار وخزاں، گرمی وسردی، صبح وشام، جنگل وبیابان، کوہ وصحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔ اخلاق و فلسفہ اور تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کیے جاسکتے ہیں۔"

1857 کے بعد بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر شبلی نعمانی نے اس صنفِ سخن کے لیے حُسن ترتیب، حُسن تعمیر، کردار اور واقعہ نگاری کے ساتھ زبان و بیان کے اہتمام پر خاص توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح حالی کے یہاں آٹھ نکات اہم رہے ہیں۔ 1۔ ربطِ کلام 2۔ خلافِ عقل باتوں سے پرہیز 3۔ مبالغہ آرائی سے گریز 4۔ مقتضائے حال کا خیال 5۔ حقیقت بیانی 6۔ جزئیات کا سلیقہ 7۔ فصاحت اور 8۔ اخلاق۔

مثنوی کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور منفرد انداز رہا ہے۔ شعرا اس میں روزمرّہ کے حالات، حُسن وعشق کی واردات، جنگ وجدل کی حکایات اور قبائلی فضیلت کے مضامین فطری اور حقیقی انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں یہ صنف شہرت نہ پاسکی مگر فارسی اور پھر اردو میں اس کو خاصی اہمیت ملی ہے۔ واقعہ نگاری، کردار نگاری اور حُسنِ ترتیب کے لحاظ سے اس نے کمالات دکھائے ہیں۔ عموماً آغاز بھولی بسری کہانیوں سے ہوتا ہے جن میں ماضی کا کوئی دلچسپ واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ شاعر کے ذہن میں واقعہ اس وقت تحت الشعور سے شعور کی طرف منتقل ہوتا ہے جب دورانِ سفر اس کا گزر کسی ایسے کھنڈر، ریگزار یا نخلستان سے ہوتا ہے جہاں کسی اہم شخصیت یا محبوبہ کی فرودگاہ ہوتی ہے وہاں وہ رُک کر دو

گھڑی اُس کی یاد میں آنسو بہاتا اور پھر خیال وخواب کی دنیا میں کھو کر صاحب کمال یا محبوب کا سراپا، حُسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ اور ہجر کے مصائب بیان کرتا ہے۔ محبت، مروّت، وفاداری، جفاکشی اور بہادری کے گیت گاتا ہے۔ حیوانات ونباتات، چرند وپرند، فضا وماحول کے مابین گھوڑے کی رفاقت اور تیز رفتاری کا ذکر کرتا ہے۔ نیکی وبدی، اچھائی و بُرائی کے ساتھ صبح وشام اور کوہ ودشت کے مناظر پیش کرتا ہے اور آخر میں کوئی بامقصد نتیجہ نکالتا ہے۔ ان میں مافوق الفطرت کرداروں اور محیرالعقل باتوں کی وجہ سے تحیّر اور تجسّس دوبالا ہو جاتا ہے۔ ''کدم راؤ بدم راؤ'' سے شروع ہونے والی دکنی مثنویوں میں مختلف موضوعات کو قلم بند کیا گیا ہے البتہ رزمیہ مثنویاں زیادہ ہیں۔

شمالی ہند کی مثنویاں بزمیہ ہیں۔ تاہم تمام قدیم مثنویوں میں تہذیب ومعاشرت کی عکاسی جا بجا ملتی ہے۔ ان کے توسط سے ہم بآسانی دکنی، دہلوی اور لکھنوی تہذیب کی مرقع کشی کو تلاش کر سکتے ہیں۔ ان میں رسم و رواج، تیج و تیوہار، جلسے وجلوس، میلے ٹھیلے، باغ کے مناظر، محلات کی آرائش، خواص کی شان وشوکت سب کچھ دیکھتے ہیں۔ جگت موہن لال رواں بھی صنف مثنوی سے بے حد متاثر تھے۔ وہ 'نقدِ رواں' میں کہتے ہیں۔

ایک مدت سے تمنا دل میں تھی
میں بھی اردو میں لکھوں اک مثنوی

مگر ایسی مثنوی جو مافوق الفطرت کرداروں اور محیرالعقل باتوں سے مبرّا ہو۔

جس میں کچھ رنگِ حقیقت بھی رہے
لذّتِ عشق و محبت بھی رہے

یوں تو ہیں بے بادہ پیمانے بہت
قالب بے روح افسانے بہت

قال ہو اور حال سے خالی نہ ہو
بُو سے عاری پھول کی ڈالی نہ ہو

اور پھر انھوں نے مہاتما بدھ کی زندگی کا انتخاب کیا۔ اچانک موت کی وجہ سے یہ فن پارہ مکمل نہ ہو سکا۔ احباب نے "نقدِ رواں" کے نام سے اسے شائع کیا۔ خواجہ قمر الدین نے اہتمام کے ساتھ مطبوعہ مذکورہ مثنوی کو ستمبر 1951 میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپوایا جس میں مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا مقدمہ تھا۔ رواں کی شاعری اس کی غماز ہے کہ اُن کو فلسفے اور ویدانت سے لگاؤ تھا۔ شری کرشن جی کے اُپدیش اور مہاتما بدھ کے فلسفے کو اشعار میں ڈھالنے کا جتن کیا کرتے تھے۔ جب مثنوی کا خیال آیا اور مرکز نگاہ گوتم بدھ ہوئے تو انھوں نے مطالعہ اور مشاہدہ کی آمیزش سے ایک نیا ہیولہ تیار کیا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

> "دورانِ گفتگو رواں سے مثنوی پر بحث ہوتی تھی۔ اُن کی دلی آرزو تھی کہ اس صنف میں بھی طبیعت کے جوہر دکھائیں۔ دھندلا سا خیال ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اڈون آرنلڈ کی "لائٹ آف ایشیا" کا بھی تذکرہ ہوا تھا۔ عجب نہیں کہ گوتم بدھ کے واقعات کو مثنوی کا ہیرو بنانے میں یہی خیال کارفرما ہو۔ اس مثنوی میں بھی رواں کی انفرادیت اوران کے کلام کی عمومی خوبیاں نمایاں ہیں۔" (ص،2)

عزیز لکھنوی اور وحشی کانپوری کا کہنا ہے کہ جب بحر کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا تو رواں کی نظر حکیمانہ و موعظانہ ترکیب کی وجہ سے مثنوی مولانا روم کی بحر پر جمی۔ بلاشبہ جو شرفِ مقبولیت مثنوی مولانائے روم کو حاصل ہوئی ہے، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی۔ چھ صدیوں سے یہ مسلسل دلوں پر حکومت کرتی رہی ہے۔ رواں کیوں نہ اس سے متاثر ہوتے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے عرفان عباسی "تذکرہ شعرائے اتر پردیش" کے دوسرے حصہ میں لکھتے ہیں:

> "مثنوی بھی ان کی انفرادیت اور عمومی خوبیوں کا آئینہ ہے۔ انھوں نے روایتی مثنوی کے من گڑھت افسانے، فرضی قصے، عریانیت و نفس پرستی اور حیا سوز جذبات والے موضوعات کے بجائے مہاتما بدھ جیسی مقدس ہستی

> کی سوانح حیات کو اپنی شہرۂ آفاق مثنوی ''مقصدِ رواں'' کا موضوع بنایا اور
> دلچسپ پیرائے میں نظم کر کے ایسا شاہکار پیش کیا جو، ابد تک ان کی یاد دلاتا
> رہے گا۔'' (ص، 134)

قلم برداشتہ لکھی جانے والی اِس نامکمل مثنوی میں تدریجی ارتقا ہے۔ پس منظر میں کپل دستو اُبھرتا ہے۔ اُس کی شان کا ذکر کرتے ہوئے رواں ایک فقیر روشن ضمیر کا ذکر کرتے ہیں جسے مہاتما بدھ کی پیدائش کا علم ہوتا ہے اور وہ بے تابانہ ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوتا ہے اور ان کی زیارت سے شرف اندوز ہو کر اس حسرت بھرے وقت کا اظہار کرتا ہے کہ میں اپنی ضعیفی کی بنا پر وہ سنہرا دور دیکھ نہیں سکوں گا جب مہاتما بالغ ہو کر دنیا کو اپنے آغوشِ رحمت میں لے لیں گے۔

مہر جب ہوگا سرِ نصف النہار
صبح کا تارا نہ ہوگا آشکار

شاہانہ انداز، ناز و نعم، مادّی آرام، بے پناہ آسائش کے سامان، توہمات، خدشات اور حسین لمحات کی آمیزش سے فضا سحر انگیز محسوس ہوتی ہے جہاں ممتا کی لوریاں، بچپن کی شرارتیں اور نوجوانی کی سرگوشیاں اُبھرتی ہیں۔ معطر ماحول میں والدین کو یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں نجومیوں کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت نہ ہو جائے کہ شہزادہ تارک الدنیا ہو جائے گا۔ لہٰذا شادی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ شہزادی جسودا کے حُسن کے ساتھ شادی کا دلفریب منظر ہے۔ ازدواجی زندگی کی رنگینیاں ہیں۔ گوتم بدھ کے فرزند (راہل) کے تولد ہونے سے قصرِ شاہی رقص و سرور سے گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے مگر ایک ضعیف شخص کو دیکھ کر گوتم بدھ میں تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اندر اور باہر کے بدلاؤ کی کشاکش کو رواں نے نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ محل ہی نہیں، بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر وہ اپنے دربان چندک کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ دریائے انوما کے کنارے پہنچ کر شاہانہ لباس چندک کے حوالے کرتے ہوئے رانی جسودا کو پیغام بھیجتے ہیں۔

اور یہ کہنا کہ اے آرام جاں — میں تلاشِ حق میں ہوتا ہوں رواں
آپ سے کچھ التجائیں ہیں مری — عفو کے قابل خطائیں ہیں مری
تاجِ شاہی نذرِ ایماں کر دیا — دل نے ہر مشکل کو آساں کر دیا

یہیں سے مثنوی دونوں کرداروں کے جذبات و خیالات کی عکاسی کرنے لگتی ہے۔ ایک جانب والدین کے ساتھ رانی جسودا کا صبر و استقلال اور بے قراری کا منظر ہے تو دوسری طرف بے نیازی، ذہنی و قلبی سکون اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی للک ہے۔ فضا نورانی ہوتی ہے۔ استفہامیہ انداز میں کائنات کی گرید، زندگی اور موت کا فلسفہ، اختیار اور بے اختیاری کا تصور اُبھرتا ہے۔ مصائب سے نجات اور حقیقت کے عرفان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ فلسفۂ توحید کی صدا گونجتی ہے۔

جو عمل، جو نقش، جو تصویر ہے
مظہرِ نیرنگیِ تقدیر ہے

فلسفۂ ذات باری تعالیٰ۔

خالق اس ارض و سما کا کون ہے — بانی اس بزمِ فنا کا کون ہے
کھل نہیں سکتا کبھی ہرگز یہ راز — بے محل ہے مذہبوں کی ترک و تاز
ایک معنی ایک ہی مضمون ہے — ذرّہ ذرّہ تابعِ قانون ہے

فلسفۂ کائنات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

دائمی ہے یہ جہانِ رنگ و بو — انتہا اس کی نہ آغازِ نمو
سب یہ موجیں حُسن اور تاثیر کی — محض کڑیاں ہیں اسی زنجیر کی
اس میں کوئی فرق آسکتا نہیں — غرب سوئے شرق آسکتا نہیں

فلسفۂ حیات و ممات کو دیکھئے۔

یا بڑھے یا آدمی پیچھے ہٹے	غیر ممکن اک جگہ پر یہ ڈٹے
دورِ ماضی میں تھا شامل حال بھی	حال میں شامل ہے استقلال بھی
یوں ہی دنیا چال چلتی جائے گی	ظاہری صورت بدلتی جائے گی
ہے یہی تفسیرِ روحِ کائنات	ہیں یہی تبدیلیاں رازِ حیات
موت سے ڈرنا خیالِ خام ہے	موت انھیں تبدیلیوں کا نام ہے

فلسفۂ ارتقا کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

عکس جو موجوں پہ پڑتے رہتے ہیں	بنتے رہتے ہیں بگڑتے رہتے ہیں
نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے سوا	ہے ہمیشہ دلفریب و جانفزا
مائلِ بامِ ترقی صبح و شام	صاحبِ ایجاد ہے فطرت تمام
زندگی کا رنگ بھرنے کے لیے	نقش مٹتے ہیں سنورنے کے لیے
ہر نفس تولید ہوتی رہتی ہے	ہر گھڑی تجدید ہوتی رہتی ہے

لکھنؤ کے قرب و جوار میں ''سحرالبیان''، ''گلزارنسیم'' اور ''زہرِ عشق'' کا خاص چرچا تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کے بند کے بند طلبا کو یاد تھے۔ رواں اس سے بے حد متاثر تھے مگر انداز جدا گانہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اثر لکھنوی اس پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

> ''رواں نے اپنی مثنوی میں گوتم بدھ کے سوانح حیات اور اس مقدس ہستی کے مقرر کردہ اصولِ حیات و طریقِ نجات کو شرح و بسط سے نظم کیا ہے۔ ایسے خشک، دقیق اور اخلاقانہ موضوع میں زبان و بیان کی خوبیاں قائم رکھتے ہوئے لطافتیں اور رعنائیاں بھر دینا رواں ہی کے معجز نگار قلم سے ممکن تھا۔ موضوع کے لحاظ سے اردو میں (فارسی سے قطع نظر) یہ مثنوی اپنی نظیر آپ ہے۔ دوسری مشہور مثنویاں مافوق الفطرت مفروضہ واقعات اور من گڑھت افسانوں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ ضمناً اس عہد کے رسم و

رواج اور طرز معاشرت کا بیان بھی آ گیا ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز ان کی
زبان کی صفائی، سلاست، لطفِ محاورہ و روزمرہ یا پھر صنائع و بدائع کے
سلیقے سے نظم ہونے میں ہے۔" (ص2,3)

"نقدِ رواں" زبان کی خوبیوں کے علاوہ معنوی زیور سے بھی آراستہ ہے۔ فلسفیانہ نکات اور متصوفانہ رُجحانات اس میں پوری شدت کے ساتھ تحلیل ہوئے ہیں جس سے مثنوی کا حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔ "فلسفۂ تناسخ" کو ملاحظہ کیجیے۔

متصل امواجِ دریا صف بہ صف　　پا بہ گل ہوکر سمندر کی طرف
جا رہی ہیں واپس آنے کے لیے　　ظاہری ہستی مٹانے کے لیے
چُھٹ کے اپنے پاؤں کی زنجیر سے　　مہر عالمتاب کی تنویر سے
پھر یہ موجیں آئیں گی بن کر سحاب　　جس سے ہوں گے کوہ و دریا فیضیاب

"جبر و قدر" کے نظریے کو رواں مثنوی میں اس طرح جذب کرتے ہیں۔

دوسرا رخ بھی ہے اس تصویر کا　　نام ہے تدبیر بھی تقدیر کا
از زمیں تا آسمانِ ہفت میں　　کیا ہے جو انساں کے امکاں میں نہیں
عرشِ اعلیٰ ہے مقامِ آدمی　　نار و جنت سب غلامِ آدمی
آپ اپنا سحر بھی، تسخیر بھی　　آپ اپنا زہر بھی، اکسیر بھی
آدمی کا چاہئے حُسنِ عمل　　ہے یہی ہر عقدۂ مشکل کا حل

نصیحت، عبرت اور درس کو لطیف تاثرات کے ساتھ پیش کرنے کا ہُنر مذکورہ مثنوی میں ملتا ہے۔ آئیڈیل شخصیت کو اس طرح پیش کرنا کہ عزت و احترام میں اور بھی اضافہ ہو جائے، اور ہماری چشمِ بصیرت بھی کُھل جائے، یہ بھی ایک کارنامہ ہے۔ خوبی یہ ہے کہ تسلسلِ بیان میں لطفِ زبان بھی ہے اور قدرتِ بیان بھی۔ ہر منظر کی تصویر اتنی خوب صورت اور دلجمعی سے کھینچی گئی ہے کہ محاکات کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ "رازِ عالم" میں پوشیدہ فلسفہ کی عکاسی دیکھئے۔

ابتدا و انتہا و درمیاں　　غم ہی غم ہے تا حدودِ دو جہاں
آرزوئے زندگانی رنج ہے　　کاوشوں سے سرگرانی رنج ہے
حسرتِ دنیا سراسر رنج ہے　　کلفتِ فردا سراسر رنج ہے
جتنی دولت اور بڑھتی جائے گی　　حرصِ ثروت اور بڑھتی جائے گی
خواہشیں پوری نہیں ہوتیں اگر　　بے بسی ہوتی ہے وجہِ دردِ سر

کائنات کے اسرار و رموز اور انسانی فطرت و جبلت کا ذکر کرتے ہوئے وہ بدعتِ بُت پرستی، پاداشِ عمل اور نجاتِ ابدی کے عنوان سے موثر انداز میں لکھتے ہیں۔ نامکمل مثنوی بھی آنکھوں کو روشن اور دل کو منور کرتے ہوئے یہ تاثیر دیتی ہے کہ اطمینانِ قلب، روشن ضمیری اور عقل کی بلند تر منزل، انسان کا اصل مقصد و حصول ہے جو اُسے 'نروان' سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ واقعات کے بہاؤ میں تسلسل اور روانی سے بھی رواں کی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے۔

1: اداریہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ۔ اکتوبر 1909۔

2: یہ مذاکرہ 14 جنوری 1992 کو اناؤ (محلہ قلعہ) کے آفتاب پریس میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت روزنامہ "اناؤ ٹائمس" کے مدیر جناب سوتنتر کمار مشر، اور نظامت شیخ وجاہت علی آفتاب ایڈوکیٹ نے کی تھی۔

رواں بحیثیت نثر نگار

1882 سے 1884 کے دوران سید حسن بلگرامی کو محمد حسین آزاد نے جو خط لکھے ہیں ان میں بار بار ''دربار اکبری'' اور ''ڈرامہ اکبر'' کا ذکر ہے۔ یہ دونوں تحریریں پہلے پہل مطبع رفاہ عام کے مالک سید ممتاز علی نے اور پھر آزاد کے فرزند محمد ابراہیم نے چھپوائیں۔ ایک عرصے کے بعد سید ممتاز علی کے لائق فرزند سید امتیاز علی تاج نے 1930 میں ''انار کلی'' کے نام سے ڈراما لکھا جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی جبکہ رواں اس موضوع پر سات سال قبل (1923) 'انار کلی' کے نام سے کامیاب افسانہ لکھ چکے تھے پھر اس افسانہ کی شہرت کیوں نہیں ہوئی؟ یا کن وجوہات کی بنا پر ان کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں یہ شامل نہیں ہو سکا؟ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑی وجہ شاید ادب میں رائج اجارہ داری ہے جس کے کئی انمول ادب پاروں یا شخصیتوں کو پردۂ خفا میں ڈھکیل دیا ہے یا پھر ان کی نامکمل تصویر ہی عوام کے سامنے آئی ہے۔ رواں بھی اس اجارہ داری کے شکار ہوئے ہیں کہ ان کے نثر کے کارناموں کو تاریخ ادب اردو میں جگہ نہیں ملی ہے۔ انھوں نے مضامین، افسانے، ڈرامے بھی لکھے ہیں مگر شہرت محض رُباعی گو کی حیثیت سے مل سکی ہے۔

ڈاکٹر ظفر قدوائی جنھوں نے شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی سے 1981 میں ''جگت موہن لال رواں: حیات اور ادبی خدمات'' پر پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی، انھوں نے رواں کے تنقیدی

مضامین کا مجموعہ ''خریطۂ جواہر'' کے عنوان سے، مکتبۂ تعمیر ادب، صفی پور، ضلع اناؤ (یوپی) سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، اثر لکھنوی، تسکین سورنوی اور دیگر مشہور شعرا کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈراما نگار

رواں نے انگریزی ادب میں ایم۔اے۔ کیا تھا۔ شعری ذوق کے ساتھ ڈراموں سے بھی دلچسپی تھی۔ کئی اہم ڈراموں کے ترجموں کے علاوہ ''سمجھاون بجھاون'' کے عنوان سے ایک ڈراما بھی لکھا جسے ظفر قدوائی نے بہ اہتمام ''انارکلی'' افسانہ کے ساتھ شائع کیا، اور اس انتخاب کا نام ''انصاف کا خون'' رکھا۔ مجموعہ کا عنوان ڈاکٹر ظفر قدوائی کا اپنا تجویز کردہ ہے جس کو انھوں نے مذکورہ مجموعہ کے نفس مضمون کے اعتبار سے اخذ کیا ہے۔

ڈراما ''سمجھاون بجھاون'' میں رواں نے پولیس کی کارکردگی اور ہندستانی عدالتوں کا خاکہ مرتب کیا ہے۔ آئے دن ہمارے سامنے ایسے واقعات آتے رہتے ہیں کہ حقیقت کے بالکل برعکس پولیس بے گناہوں کو ستاتی ہے، چالان کرتی اور روپے اینٹھتی ہے۔ اصل مجرموں کی نہ تو تلاش ہوتی ہے اور نہ ان سے کوئی تعرض یا پوچھ گچھ، چھان بین کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے بلکہ ان کو کھلی چھوٹ ملتی رہتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں انسداد جرم کیسے ممکن ہے، ڈراما قاری کے سامنے یہ سوال پیش کرتا ہے۔ ''سمجھاون بجھاون'' چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تحقیقات مار پیٹ اور چالان کے منظر و پس منظر کو پیش کرتا ہے۔ بابِ دوم وکیل صاحب کے مکان پر ہونے والی گفتگو پر مبنی ہے۔ باب سوم عدالت میں پیش آنے والے واقعات کو اُجاگر کرتا ہے اور بابِ چہارم تجویز مع حکم کے ہے۔ ڈرامے کے آغاز میں ہی مصنف نے ''معذرت'' کے عنوان سے لکھا ہے۔

دل آزاری کسی کی ہو نہیں یہ اپنی نیت ہے
ظرافت سب کو بھاتی ہے یہ کچھ انساں کی فطرت ہے

ذرا یہ ہنس کے سن لیجئے چلن کیسا ہے دنیا کا
عدالت کیسے ہوتی ہے پولیس کی کیسی حالت ہے
پسندیدہ بھلا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا
ظرافت کی ظرافت ہے حقیقت کی حقیقت ہے
مگر اک بار اپنی دست بستہ پھر گذارش ہے
دل آزاری کسی کی ہو نہیں یہ اپنی نیت ہے

''سمجھاون بجھاون'' میں رواں نے عدالت کا جو نقشہ کھینچا ہے دیا نرائن نگم نے اُس کے تعلق سے 'زمانہ' میں لکھا ہے کہ وہ من وعن ہماری پنچایت کا ہے۔ سرپنچ جسے ہم حاکم عدالت کہہ سکتے ہیں کچھ ایسے حلیہ اور انداز کے ہم کو دیکھنے میں ملیں گے، خاص طور سے بندیل کھنڈ کے قرب وجوار میں۔ احسان آوارہ باندوی اسے کانپور اور فتح پور کے مابین آباد گنگا کے کنارے کی بستی قرار دیتے ہیں جس کے اثرات بنکی اور باندہ میں بھی نظر آتے ہیں۔ ظفر قدوائی کا کہنا ہے کہ رواں کے زمانے میں ان پنچایت عدالتوں کا وجود نہیں تھا لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رواں کی نگاہِ دور بین ان عدالتوں کو دیکھ رہی تھی جس کا تذکرہ رواں نے اس ڈرامے میں کیا ہے۔ فضا اور ماحول پریم چند کی تخلیقات سے بہت قریب ہیں بلکہ کہیں کہیں ان کی پیروی بھی نظر آتی ہے۔

مکالموں کی برجستگی اور واقعہ نگاری کے ساتھ فضا آفرینی نے ڈرامے کو نہایت دلچسپ اور ہنسی مذاق سے پُر بنا دیا ہے۔ کرداروں کی زبان خالص بیسواڑہ (اناؤ) کی مروجہ دیہی زبان ہے جو اس پورے خطے کے گاؤں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے (رمئی کاکا کی شاعری خصوصاً ''بوچھار'' میں یہ زبان نکھر کر آئی ہے)۔ کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ ڈراما بہتر ہے۔

افسانہ نگار

افسانوں میں ان کا سب سے اچھا افسانہ ''انارکلی'' قرار دیا جا سکتا ہے1۔ اس میں منظر نگاری بھی خوب ہے اور کرداروں میں سب سے زیادہ متحرک اور موثر کردار ''انارکلی'' کا ہے۔ وہ

اپنے احباب میں اس کا تفصیلی ذکر بلکہ اکثر بحث کرتے تھے کہ محمد حسین آزاد نے جہانگیر اور نور جہاں کے عشق کو فوقیت دی، سلیم اور انارکلی کا واقعہ کہیں بھی بیان نہیں کیا ہے۔ کیا ایک حقیقی دوسرا تخیلی ہے؟ پھر تصوراتی قصہ کی مقبولیت کیوں؟ کیا لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی عوامی قصہ کی روایت کا حصہ ہے؟ اس کشاکش کے علاوہ اس افسانہ کی تخلیق کا یہ بھی سبب ہوسکتا ہے کہ رواں نے جس ماحول میں پرورش پائی وہاں یہ قصہ مقبول تھا۔ پارسی تھیٹر اور آغا حشر کاشمیری بھی انارکلی کی روداد کو خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ اس قصہ کو صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کا خیال انھیں 1922 میں آیا 1923 میں اسے مکمل کیا۔ اٹھارہ صفحے کی کہانی کو رواں نے آٹھ حصوں میں منقسم کیا ہے۔

اوّل: نادرہ کی خوب صورتی اور الھڑ پن کا ذکر اور 'انارکلی' خطاب کا بیان ہے۔ خوش گوار فضا کو موثر بنانے کے لیے تشبیہات واستعارات سے کام لیا گیا ہے۔

دوئم: انارکلی کے حسن کے چرچے، شہزادہ سلیم کی بے قراری اور پھر ڈرامائی انداز میں دونوں کی ملاقات کا بے حد رومانی منظر ہے۔

سوئم: حسن وعشق کا ڈرامائی ملاپ ہے۔ عاشق ومحبوب تصورات کی دنیا میں کھو کر خیال وخواب میں حسین وجمیل محل تعمیر کرتے ہوئے دنیا کے تمام مسائل سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری کائنات مسرور ہے، نغمہ زن ہے۔

چہارم: یکا یک فضا بدلتی ہے۔ انارکلی پر اکبر اعظم کا عتاب نازل ہوتا ہے۔

پنجم: خوف، مایوسی اور اُداسی کی نمناک فضا میں قید وبند کی صعوبتیں قصہ میں بے حد تناؤ پیدا کر دیتی ہیں۔

ششم: قید خانے کی ہولناک فضا میں غم کے ماروں کی ملاقات۔ سلیم، انارکلی کو رہائی پر اُکساتا ہے اور وہ مجبوراً فرار پر تیار ہو جاتی ہے مگر جیل کا داروغہ رحیم خاں جو سلیم کی دوستی کا دم بھرتا ہے، وہ صورتِ حال کو بدل دیتا ہے۔

ہفتم: مایوسی اور نا اُمیدی کی حالت میں انارکلی ہیرے کی انگوٹھی چاٹ کر جان دے دیتی ہے۔

ہشتم: اس آخری حصہ میں کئی منظر ہیں مثلاً اکبر کی وفات۔ سلیم کا تخت شاہی پر نور الدین جہانگیر کے نام سے جلوہ افروز ہونا، مہرالنساء کا عشق۔ اچانک قبر کو دیکھ کر انارکلی کی یاد اور پھر دارو غۂ عمارت کو حکم کہ اس جگہ ایک عالیشان عمارت تعمیر کر دی جائے اور یہ شعر اس عالیشان عمارت پر کندہ کر دیا جائے۔

تا قیامت شکر گویم کرد گار خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را

افسانہ کا واقعاتی ڈھانچہ چار افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں تین مرد اور ایک عورت ہے۔ مردوں میں ایک باپ، دوسرا بیٹا اور تیسرا کردار دوست کا ہے۔ باپ کا نام جلال الدین محمد اکبر، بیٹے کا نام شہزادہ سلیم (نور الدین جہانگیر) اور دوست کا نام رحیم خاں ہے۔ مرکزی کردار عورت کا ہے جس کا نام نادرہ اور خطاب 'انارکلی' ہے۔ عوام میں مقبول عشق کی اس برسوں پرانی روداد کو روشؔ نے سیدھے سادے مگر رومانی انداز میں بیان کر دیا ہے۔ واقعات کی ترتیب و تنظیم قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ شہنشاہ کی قربت و جاہت کے ساتھ غصہ اور سزا یعنی حسین واقعات یک لخت خوفناک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہوئی لطف و نشاط کی شعاعیں بالکل بجھی ہوئی، پژمردہ شکل اختیار کر لیتی ہیں کہ نورِ نظر، مجرم بن گئی۔ ہولناک سناٹے میں بے دردانہ موت کا اعلان سن کر موت کا لرزہ خیز تصور غالب آ جاتا ہے۔ دلکش خیالات سوہان روح ہوتے ہیں۔ عشق کے اس انجام پر ڈھارس نہیں، قرار نہیں، اطمینان نہیں۔ طرح طرح کے سوالات اور خدشات میں گھری انارکلی تذبذب میں مبتلا نظر آتی ہے کہ کیا سلیم اس سے عشق کرتا ہے؟ اور اگر کرتا بھی ہے تو اس صورتِ حال میں وہ کیا کر سکے گا؟ ممکن اور ناممکن کے تلاطم میں ڈولتی ہوئی انارکلی اپنی مکمل اور مؤثر شبیہہ پیش کرتی ہے۔

ادب میں رقابت کے مختلف انداز محبت کے مابین نظر آتے ہیں۔ اس افسانہ کا رقیب، رفیق بھی ہے اور دغا باز بھی۔ صورتِ حال کی ایسی عکاسی جہاں قاری کو افسوس بھی ہو اور اطمینان بھی،

دلائل اور جواز کے ساتھ ملی جلی کیفیت کا بھرپور اور ڈرامائی اظہار جس میں مکالمے چست اور برمحل ہیں۔ دوستی اور فرض میں جہاں ایک طرف خود غرضی جھانکتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف محبت میں قربانی کا جذبہ، کچھ نثار کرنے کا حوصلہ ہے۔ صبر، شکر و قناعت ہے تو تقدیر و تدبیر کی کشمکش بھی۔

پلاٹ کا ارتقا، واقعات اور جزئیات کا بیان سلیقے اور ترتیب کے ساتھ ہے۔ وقت اور مقام کا تعین بھی محسوس ہوتا ہے۔ مناظر کا بیان نہایت دلکش اور جذباتی لب ولہجہ میں ہے۔ یہاں تک کہ دلی جذبات و کیفیات کے اظہار میں مقام و مرتبہ کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ مصنف کی تخصیص و تمیز کو مٹا دینے کی للک عیاں ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا نسوانی کردار چاہت میں سب کچھ نثار کر دیتا ہے۔ محبت کا پہلا احساس، لمس کی پہلی کیفیت کے ساتھ جذبات کی فراوانی کا حسین بیان ہو یا رنگارنگ تصویریں، آداب محفل کا منظر ہو یا شیش محل کی جلوہ فرمائیاں، رواں ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے جب وہ ہرن کی آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آنسوؤں کا نکلنا اگر ایک قصہ بیان کرتا ہے تو موتی سے مشابہت ایک دوسرے واقعہ کی طرف قاری کے ذہن کو موڑ دیتی ہے۔ اسی طرح صاف چمکتی ہوئی زمین پر گر کر اس آنسو کا ہمیشہ کے لیے مٹ جانا، اختتامیہ کو واضح کرتا ہے۔ انھوں نے اسی کے توسط سے خوشی اور غم، زندگی اور موت، فنا اور بقا کے فلسفہ کو بیان کر دیا ہے۔

یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ گاندھی جی کی تحریک سے متاثر ہو کر، فروری 1921 میں پریم چند سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ جولائی میں گنیش شکر ودیارتھی اور جگت موہن لال رواں کے بھائی تربھون ناتھ، جو کانپور میں وکیل تھے، کے وسیلے سے پریم چند کانپور کے مارواڑی ودّیالیے میں صدر مدرس ہوئے۔ کانپور میں تقریباً آٹھ ماہ کا یہ قیام پریم چند اور رواں ے لیے بے حد اہم تھا۔ دونوں میں افسانے اور ڈرامے پر بحث ہوتی۔ بحث و مباحثے کے مراکز تربھون ناتھ کا گھر، زمانہ کا دفتر یا خانقاہ شریف یعنی ثاقب صاحب کی قیام گاہ۔ یہیں افسانہ کے تشکیل عناصر پر اتفاق ہوا کہ اس میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر، فنی ترتیب، سرخی، تمہید اور اختتامیہ ہو۔ وہ کسی بھی

موضوع پر ہو، اس میں اختصار و ربط ہو، لہجے اور انداز کی ہم آہنگی ہو، اتحاد زماں، اتحاد مکاں اور اتحاد عمل ہو۔

رواں بنیادی طور پر شاعر تھے مگر افسانوی ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ افسانہ انسانی زندگی کے تعلق سے اس کے تمام تر محرکات وعوامل، گوناگوں مشاغل، سانحے نشیب وفراز اور واقعاتی مد و جزر کو اپنے اندر سموتے ہوئے اس طرح ادبی پیکر میں ڈھلتا ہے کہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو منعکس کر کے قاری کے ذہن پر ایک بھرپور تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ افسانہ انسانی زندگی سے براہ راست متعلق ہونے کے سبب، اسی کی طرح متحرک اور تغیر آمیز بھی ہے۔ انسانی زندگی میں جیسے جیسے تبدیلیاں آتی ہیں اور جیسا اس کا مزاج بنتا ہے اسی پیکر میں افسانہ بھی ڈھلتا رہتا ہے۔ افسانہ کی روح وحدت تاثر ہے۔ یہی افسانہ نگار کا قطعی نصب العین ہوتا ہے جسے وہ کم سے کم وقت میں اپنے قارئین کے ذہنوں پر نقش کر دینا چاہتا ہے۔ اس کی خاطر وہ اپنے تجربات، مشاہدات، تخیلات اور تصورات کا سہارا لیتے ہوئے تخلیق کے پُر پیچ ذہنی مرحلوں سے گزر کر واقعات کا سحر انگیز تانا بانا تیار کر کے ان کرداروں کو روشناس کراتا ہے جو ماحول اور فضا سے ہم آہنگ ہو کر اس کے مقصود کی تکمیل کر سکے۔ افسانہ کے تشکیلی لوازم سریت، تجسس، ندرت، جدّت، جامعیت میں ڈوب کر قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ اس کی دلچسپی اول تا آخر برقرار رہتی ہے اور قاری کا ذہن اس واحد تاثر کو قبول کر لیتا ہے جو افسانہ کی تخلیق کا سبب ہوا ہے، تو افسانہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

رواں کا عہد آج سے بڑا ہی مختلف تھا۔ اس دور کے معاملوں اور اُن کے تقاضوں میں نمایاں فرق آچکا ہے پھر بھی یہ افسانہ اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا محور ہندستانی تہذیب و روایت میں عشق کی فوقیت ہے۔ اس میں مغلوں کا جاہ وجلال اور عشق کی تابناکی ہے۔ اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ رواں کو ''انارکلی'' کے واقعہ سے رغبت تھی۔ انھوں نے نیم تاریخی واقعات اور اس کے حقائق کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ مختلف واقعات کے جزئیات کی

ترجمانی کی ہے۔ ان کی نظر روایتی حقائق کو زیادہ سے زیادہ قریب رکھنے کے ساتھ بیان اور زبان کی فصاحت پر بھی رہی ہے۔

تاریخی یا نیم تاریخی واقعات کو فکشن کا موضوع بنا کر ادیب بہت بڑی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ وہ تُحیر یداور جستجو جو قاری کو کسی بھی کامیاب قصے میں گم ہو جانے پر مجبور کرتی ہے، تاریخی موضوع میں ناپید ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ پڑھنے والا تاریخی کرداروں کے انجام سے آشنا ہوتا ہے اور مصنف کا طرز فکر تاریخی حقائق سے چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتا۔ اس صورت حال میں افسانہ نگار کے ہاتھ میں صرف ایک حربہ رہ جاتا ہے، اور وہ ہے فنی تاثیر جو قاری کے قصہ میں محو ہو جانے کا واحد سبب ہے۔ اس نکتہ کے پیش نظر جگت موہن لال رواں نے اپنے تاریخی، طبقاتی اور تہذیبی شعور اور مطالعے و مشاہدے کی وسعت کے ذریعے افسانہ ''انارکلی'' میں تابنا کی پیدا کی ہے۔ مغلوں کی تہذیب، ان کا جاہ و حشم، رزم و بزم اور اس کے پس پردہ اقتدار کی قربت و خواہش اور اس کی تکمیل کے حربوں کے جواز کو رواں نے نہایت فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

---

1 : رواں نے کئی افسانے لکھے۔ 1930 میں ماہنامہ ''جن'' میں اُن کے دو افسانے شائع ہوئے۔ لکھنؤ سے یہ رسالہ نیاز فتح پوری نے مجنوں گورکھپوری کے تعاون سے نکالا تھا۔ اگلے سال انھوں نے اپنا ایک اور افسانہ چھپنے کے لیے بھیجا مگر وہ رسالہ ہی بند ہو گیا۔

اختتامیہ

چودھری جگت موہن لال رواں شاعر ہیں، نثر نگار، قانون داں اور ماہر شکاریات ہیں۔ ہر زاویے سے ان کے فن، فکر اور کلام میں خوبیاں نمایاں ہیں ان کی شاعری کے تین مجموعوں (1۔روحِ رواں 2۔ باقیات رواں 3۔ رباعیات رواں) کے علاوہ کئی تحریریں رسائل میں دستیاب ہیں۔تاجور نجیب آبادی، ''رباعیاتِ رواں'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اگر جناب رواں کی کل ہند ادبی وشاعرانہ مرتبت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ مختصر مجموعہ ان کی شاعرانہ عظمتوں اور ان کی ادبی خدمات کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔'' (ص،10)

شاعری میں اگر نظم کے حصہ کو دیکھیں تو اس میں انھوں نے حالی اور آزاد کی روایت تو انا رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مناظر فطرت کی حقیقت نگارانہ عکاسی اور شعریت کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف عنوانات پر کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ انگریزی نظموں کے جو ترجمے کیے ان میں بھی اپنی شاعرانہ اپروچ کو برقرار رکھا ہے۔ ان کو فضا اور ماحول کو فطری انداز میں پیش کرنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ چاہے لہلہاتے ہوئے کھیت ہوں، پھلوں سے لدے ہوئے باغ ہوں، بہتا ہوا دریا ہو یا موجیں مارتی ہوئی لہریں ہوں۔ رواں اپنے بصری پیکر تراشتے ہیں کہ

قاری ان کے تصور میں گم ہو جاتا اور یہ سارے منظر حسبِ منشا ادب پارے کا جز بن جاتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں براہ راست تخاطب کا طریقہ اور وضاحتی انداز ہے۔ حزن و یاس کی کیفیت کے باوجود تازگی اور بے نیازی کا احساس ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے احساسات و جذبات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے مگر رومانیت حاوی رہی ہے۔

رواں کی غزلوں میں بھی رعنائی، بانکپن، جوش اور اُمنگ ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہو یا رازِ زندگی کا اظہار، رواں نے ان سب کا بیان مخصوص انداز میں کیا ہے۔ جمالیات، محبت اور فطرت کی آمیزش کے ساتھ زبان کا لطف اور بے ساختگی ہی نہیں فلسفہ اور اخلاق کے مسائل بھی رنگِ تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں بلکہ ان کی غزلوں میں رنج و نشاط کا حسین امتزاج ہے۔ اس امتزاج میں کیف آگیں خیال انگیزی، جذبات کا وفور، والہانہ شیفتگی اور سرشار کر دینے والی کیفیت ہے۔ زندگی کو مختلف رنگوں اور جھلکیوں میں دیکھنے والا یہ شاعر، اظہارِ عشقیہ جذبات کی وساطت سے ہی کرتا ہے جن میں وارداتِ قلبی، خوشی و غم کی ملی جلی پرتوں میں موجزن ہوتی ہے۔ رواں کی غزلوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں طے شدہ، مقررہ اور مفروضہ تصورات کے بجائے حسن و عشق، ہجر و وصال، قربت و دُوری کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ طرفگیِ خیالات اور جدتِ ادا سے مالا مال غزلوں میں تنوع، تازگی اور اثر آفرینی ہے۔ افکار و نظریات کی بلندی کے ساتھ طبیعت کی شوخی، تخیل کی رنگینی، طرزِ ادا کی دلکشی رواں کی غزلوں کی اہم خصوصیات قرار دی جاسکتی ہیں۔

رُباعیات اُن کے تینوں مجموعوں میں موجود ہیں بلکہ ایک تو محض رباعیات کا ہی مجموعہ ہے جو اصغر گونڈوی اور تاجور نجیب آبادی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ رواں نے جو رباعیاں لکھی ہیں وہ اپنے رنگ و آہنگ میں بے مثل ہیں۔ دیگر بڑے شاعروں کی طرح رواں کی طبیعت میں بھی تجسس اور غور و فکر کا عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جب تک کوئی خیال ان کے قلب و ذہن پر پوری

طرح نقش نہ ہو جائے وہ اسے اشعار میں نہیں ڈھالتے تھے۔ دینی اور دنیادی، خوشی و غم، زندگی و موت کے کسی بھی پہلو پر جب تک وہ مطمئن نہیں ہو جاتے، خیالات صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں ہوتے۔ تجسس، کرید، کشمکش، تناؤ کو اکثر استفہامیہ قالب میں ڈھال دیتے جیسے یہ کائنات سوالیہ نشان بن کر ان کے سامنے کھڑی ہو، اور ان سے جواب طلب کر رہی ہو کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ اور ایسا کیونکر؟ یہ سلسلہ کب تک دراز رہے گا؟ اس کا اختتام کیا ہے؟ کیا موت قاطعِ حیات ہے؟ ذہنی انتشار، روح کی بے چینی اور قلبی سکون ان کی رباعیوں میں سمٹی ہوئی ہیں۔ جلیل قدوائی دسمبر 1934 کے الناظر (لکھنؤ) میں لکھتے ہیں:

"......رباعی میں وہ اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ تمام اردو شاعری میں بے حد مترنم، پُر جوش سانچے میں ڈھلی ہوئی اور عمیق خیالات و جذبات سے مالا مال گویا سچی اور صحیح معنوں میں رباعیاں صرف رواں نے لکھی ہیں۔ ان کا نام بحیثیت رباعی کے ایک مجدد کے ایک دن لازوال شہرت حاصل کر کے رہے گا۔" (ص، 39)

ہر صنف میں طبع آزمائی کرنے والا یہ فن کار اپنے ملک کے لیے بے حد انسیت رکھتا تھا اور شاید اسی سبب وہ حسرت کا بہت احترام کرتا تھا۔ حسرت کی طرح رواں کی بھی یہ تمنا تھی کہ ملک آزاد ہو اور یہ تبھی ممکن تھا جب ہر فرد قومی اور ملکی جذبہ سے سرشار ہو جیسا کہ اس رباعی میں کہا گیا ہے۔

لازم ہے ہر اک فرد کو قومی احساس
دشواریاں بھی اس میں ہیں بے حد و قیاس
جب جان پر کھیلنا ہے کیا اس کا گلہ
یہ بادِ مخالف ہے وہ آتی نہیں راس

بیسویں صدی کی دوسری، تیسری دہائیوں میں حساس ذہن قومی اور وطنی محبت میں شدت پیدا کرنے کے امکانی جتن کر رہے تھے۔ اس کا احساس رواں کے اکثر اشعار میں ملتا ہے۔

محافظ جان کے دشمن ہیں ابنائے وطن غافل
رُلاتی ہے لہو یہ حالتِ ہندوستاں مجھ کو

ستم پر ناز تھا صیاد کو اس کی خبر کیا تھی
کہ دیں گی درس آزادی قفس کی تیلیاں مجھ کو

اس نشاطِ زندگی پر ناز ہے ہم کو رواں
وقفِ تدبیرِ غلامی جس کی گھڑیاں ہو گئیں

چمن چمن نہ رہا جب تو ہم سے کیا مطلب
قفس نصیب ہو یا شاخِ آشیانے کی

یہ تیور اور یہی انداز اُن کے قطعات میں بھی نظر آتے ہیں کہ ان میں عبرت اور نصیحت کے ساتھ شکایتِ زمانہ اور ویرانی دل کو فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ صنفِ مثنوی میں انھوں نے کمال دکھایا ہے۔ وہ "مقصدِ رواں" میں لکھتے ہیں۔

ایک مدّت سے تمنا دل میں تھی
میں بھی اردو میں لکھوں اک مثنوی

مگر ایسی مثنوی جو مافوق الفطرت کرداروں اور محیرالعقل باتوں سے مبرّا ہو۔

جس میں کچھ رنگِ حقیقت بھی رہے
لذّتِ عشق و محبت بھی رہے

یوں تو ہیں بے بادہ پیمانے بہت
قالب بے روح افسانے بہت

قال ہو اور حال سے خالی نہ ہو
بُو سے عاری پھول کی ڈالی نہ ہو

اور پھر انھوں نے مہاتما بدھ کی زندگی کا انتخاب کیا، اور بحر کے لیے ان کی نظر شہرۂ آفاق مثنوی

مولانا روم کی بحر پر جمی۔ قلم برداشتہ لکھی جانے والی رواں کی اس نامکمل مثنوی میں تدریجی ارتقا ہے۔ پس منظر میں کپل دستو ہے۔ مہاتما بدھ کی پیدائش، شاہانہ انداز، ناز ونعم، مادّی آرام کے دلفریب مناظر کے بعد شہزادی جسودا سے شادی، ازدواجی زندگی، راہل کی پیدائش اور پھر اچانک قصرِ شاہی سے دل اُچاٹ ہونا۔ اندر اور باہر کے بدلاؤ کی کشاکش کو رواں نے مذکورہ مثنوی میں نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ استفہامیہ انداز میں کائنات کی کُرید، زندگی اور موت کا فلسفہ، جبر، اختیار اور بے اختیاری کا تصور، مصائب سے نجات اور حقیقت کے عرفان کو بہت خوبی سے اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ نامکمل مثنوی بھی آنکھوں کو روشن اور دل کو منور کرتے ہوئے یہ تاثر دیتی ہے کہ اطمینانِ قلب، روشن ضمیری اور عقل کی بلند تر منزل، انسان کا اصل مقصد وحصول ہے جو اُسے 'نروان' سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ واقعات کے بہاؤ میں تسلسل اور روانی سے بھی رواں کی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے۔

نثر کے میدان میں دیکھا جائے تو انھوں نے مشہور شعرا کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، تبصرے کیے ہیں، ترجمے کیے ہیں۔ 'سمجھاون بجھاون' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا جو اناؤ کچہری میں کئی بار اسٹیج بھی ہوا۔ اس میں انھوں نے پولیس کی کارکردگی اور ہندستانی عدالتوں کا دلچسپ خاکہ مرتب کیا ہے۔ آئے دن ہمارے سامنے ایسے واقعات آتے رہتے ہیں کہ حقیقت کے بالکل برعکس پولیس بے گناہوں کو ستاتی ہے، چالان کرتی اور روپے اینٹھتی ہے۔ اصل مجرموں کی نہ تو تلاش ہوتی ہے اور نہ ان سے کوئی تعرض یا پوچھ گچھ، چھان بین کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے بلکہ ان کو کھلی چھوٹ ملتی رہتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں انسدادِ جرم کیسے ممکن ہے، ڈراما 'سمجھاون بجھاون' قاری کے سامنے یہ سوال پیش کرتا ہے۔ مکالموں کی برجستگی اور واقعہ نگاری کے ساتھ فضا آفرینی نے ڈرامہ کو نہایت دلچسپ اور ہلکی مذاق سے پُر بنا دیا ہے۔ کرداروں کی زبان خالص بیسواڑہ (اناؤ) کی مروجہ دیہی زبان ہے جو اس پورے خطے کے گاؤں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ ڈراما بہتر ہے جبکہ افسانوں میں ان کا سب سے اچھا افسانہ ''انار

کلی' ہے۔ اس میں منظر نگاری بھی خوب ہے اور کرداروں میں سب سے زیادہ متحرک اور موثر کردار 'انارکلی' کا ہے۔ اس افسانہ کی تاریخی اہمیت بھی ہے کہ یہ امتیاز علی تاج کے ڈراما 'انارکلی' سے سات سال پہلے یعنی 1923 میں لکھا گیا ہے۔

نثر و نظم، دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والا ادیب، بنیادی طور پر شاعر ہے اور ایسا شاعر جس نے محض شوکت الفاظ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس کے فن پاروں میں معنویت کا درجہ بھی موجزن ہے۔ عزیز لکھنوی نے اپنے طویل مقدمہ میں رواں کے کلام میں درج ذیل نکات کی نشاندہی کی ہے۔

1۔ اُن کے یہاں جذبات کی فراوانی اور جوش و خروش ہے۔
2۔ سائنس و فلسفہ و الٰہیات کے دقیق مسائل کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرنے کا ہنر آتا ہے۔
3۔ اندازِ بیان میں نُدرت، تازگی، سلاست اور روانی ہے۔
4۔ تخئیل فلک پیا مگر اشعار اغلاط سے پاک ہیں۔
5۔ درد و تاثیر کی لہروں کے ساتھ احساسِ قومیت اور اخلاقیات کا بھرپور درس ہے۔

رواں نے جدید تعلیم و تربیت کے پیش نظر، علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کے بیشتر مضامین اپنے اشعار میں نظم کیے ہیں، اُس طرح نہیں جیسے کوئی فلسفی یا سائنس داں مسائلِ حکمیہ بیان کرتا ہے بلکہ دقیق اور خشک موضوعات شاعر کی شیریں زبان میں فطری طور پر ڈھل گئے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست کو سلیقے اور جدید طریقے سے پرونے کی بنا پر رنگینی و اثر آفرینی ان کے اشعار میں رچی بسی ہے۔ خود کہتے ہیں۔

جو زمانے کے خیالات ہیں کرتا ہوں ادا
جانئے آپ مرے دَور کی تصویر مجھے

اور یہ تصویر بھی ایسی کہ۔

ازل سے آئینہ بردار ہے دلِ شاعر
نہاں ہے شعر میں تاریخ ہر زمانے کی

رواں کی نظموں، غزلوں اور رُباعیات میں ہی نہیں، قطعات میں بھی شوکتِ الفاظ تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کا برمحل استعمال ہے، وہ بھی ایسا کہ جدّتِ ادائیگی اور ندرتِ فکر کے ساتھ معنویت اور تاثیر بھی مجروح نہیں ہوتی ہے۔ انہی کی زبانی سُنیے ۔

مرے جذبات کی ندرت ہے قائم حسن لفظی پر
نہیں ہے اس لیے کچھ فکرِ اندازِ بیاں مجھ کو

اُن کے اندازِ فکر اور شعر کہنے کے طریقے پر نیاز فتح پوری اور ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے کہ حسن و عشق کا بیان ہو، فطرت کی عکاسی یا جذبات کی فراوانی کا معاملہ، جگت موہن لال رواں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں اپنی بات کو لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی کے اس اقتباس پر ختم کرنا چاہتا ہوں:

''رواں کے شعر کہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی طرح غزل کہنے کے قبل تین چار روز تک اپنی طبیعت کو شاعرانہ خیالات سے مانوس کرتے ہیں۔ کسی فلسفہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں یا کوئی فارسی دیوان دیکھتے ہیں۔ جب مادہ میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور جذبات متحرک ہو جاتے ہیں اُس وقت فکر کرتے ہیں۔ دو تین گھنٹے میں غزل تیار ہو جاتی ہے۔ زبردستی طبیعت کو شعر کی طرف متوجہ نہیں کرتے۔'' (روحِ رواں، ص، 14)

انتخاب نظم و نثر

منظومات

بال گنگادھر تلک کی وفات پر

عجیب مداز ہے نیرنگِ عالم فانی جسے سمجھنے سے قاصر ہے عقل انسانی
بلائے روح ہے اس زندگی کی طغیانی ہر ایک بات ہے اک موجب پریشانی
نہ لطف جینے میں ہے کچھ نہ لطف مرنے میں
جو لطف ہے تو کوئی کام کر گزرنے میں

جیے وہ لوگ بھی دنیا میں جو تھے خانہ خراب کہ حرص جینے کی تھی جن کو زندگی کا عذاب
خراب اُن کا لڑکپن رہا تباہ شباب عمل تھے جن کے زمانہ کو وجہ استعجاب
جیے اگر تو کسی نے بھی کی نہ کچھ پروا
مرے اگر تو کسی نے بھی کی نہ آہ و بکا

کچھ ایسے لوگ بھی رہتے ہیں خلق میں ہر آں جو افتخار عزیزاں ہیں نازشِ دوراں
ذرا سی اُن کی مصیبت پہ خلق ہے نالاں ہے ان کی سر کی گرانی ہر اک بشر کو گراں
ہے اُن کو رنج تو ہر فرد کا خیال ہے، یہ
کہ بس ہمارے کسی فعل کا مآل ہے یہ

اس امتیاز میں موقع نہیں تحیر کا　　مقدرات عمل ہی کا نام ہے دنیا
مآل زیست ہے نیکی بلا غرض کرنا　　ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

دگر نہ جینا ہی کچھ فخر کا مقام نہیں
کہ زیست آمد و رفت نفس کا نام نہیں

ہوئے ہیں جمع جو آج اس مقام پر احباب　　ہر ایک قلب ہے مضطر ہر ایک دل بے تاب
اس اجتماع عزیزاں سے یہ غرض ہے جناب　　کہ اس کی زیست پر آنسو بہائیں سب احباب

حبیب قوم جو دکھ دوسروں کا سہتا تھا
کسی کو درد ہو وہ اشکبار رہتا تھا

زبان و دل میں تفاوت نہ جس کے تھا اصلا　　وہی عمل بھی کیا دل سے جو زبان سے کہا
کڑی اٹھائی سہیں سختیاں وطن چھوڑا　　شکن جبین پہ آئے مگر مجال یہ کیا

ارادہ باندھ کے ہٹنا نہ اس نے سیکھا تھا
قدم بڑھا کے پلٹنا نہ جس نے سیکھا تھا

جگر میں جس کے تھا اک خار قوم کا ادبار　　ہمیشہ مد نظر تھا جسے وطن کا سدھار
لیاقت اور فضیلت میں علم کا اوتار　　مزاج منکسر اور طبع خوگر ایثار

فدائے نقش قدم تھے اگر چہ دولت و مال
کیا نہ بھول کے تن پروری کا جس نے خیال

گزشتنی ہے یہ دنیا نہیں ہے موت کا غم　　نظیر اس کا نہیں ہے فقط اسی کا الم
نجات روح کو دے اس کے خالق عالم　　ہماری خود غرضی ہے کہ اشکبار ہیں ہم

تلک نہیں ہیں مگر ان کا کام باقی ہے
چراغ راہ ترقی یہ نام باقی ہے

معمائے فطرت

شب کے سناٹے میں جب خاموش ہوتا ہے جہاں
میری چشم دور بیں رہتی ہے اکثر خوں فشاں
جب نہیں ہوتی مُخل کوئی صدا نزدیک و دور
محو فکر اس وقت ہوتی ہے میری طبع غیور
دل ہی دیتا ہے جواب اور دل ہی کرتا ہے سوال
اس طرح ترتیب پا جاتی ہے اک بزم خیال
جنبشِ برگ شجر سے تابہ رفتار خیال
اس دل مضطر کو ہے ہر چیز سے حیرت کمال
صبح کاذب کا سماں یہ صبح صادق کا ظہور
جلوۂ رنگ افق میں نغمہ سنجی طیور
جھونکے وہ ٹھنڈی ہوا کے مایۂ جان بہار
جن میں مضمر ہے سراسر رازِ امکانِ بہار
دن کا وہ بڑھنا وہ دنیا میں حرارت کا فروغ
جس سے ہوتا ہے ہویدا نور فطرت کا فروغ
شام کا دلکش سماں نیرنگ چرخ فتنہ ساز
گیسوے شب کا وہ روئے روز پر ہونا دراز
چہرۂ دنیا پہ وہ تاریکیٔ شب کی نقاب
وہ ستاروں کا چراغاں اور نور ماہتاب
دور از امکانِ عقل از بس تحیّر زا ہیں یہ
کس طرح ہیں کس زمانے سے ہیں کیوں ہیں کیا ہیں یہ

تتلی

آ ٹھہر جا! پیاری تتلی شاخِ گل پر کوئی دم — تیرے اِن رنگیں پروں کے ہیں بہت مشتاق ہم
حسن صدقے ہے ترے رنگ پر پرواز پر — لوٹی جاتی ہیں ادائیں تیرے ہر انداز پر
اُڑتا پھرتا ہے ہوا پر ساغرِ زرّیں کوئی! — کر رہی ہے سیر یا معشوقۂ رنگیں کوئی
بن کے یوسف حسن خود آیا ہے یا بازار میں — پڑ گئی ہے جان تازہ یا گلِ گلزار میں
یا مُصوّر شوخیٔ معشوقۂ رعنا ہے تو — یا مجسم رنگِ روئے عاشقِ شیدا ہے تو
جسم ہلکا سا ترا بازو سُبک اور پر سُبک — آتشِ گلشن کے ہیں شعلے سُبک اخگر سُبک
کالی، پیلی، نیلی، عنابی، گلابی، سبز، لال — تو نظر جس رنگ میں آتی ہے دلکش ہے کمال
ہلکی پھلکی گرچہ ہے تو اک ذرا سی جاندار — دیکھتے ہیں تجھ میں ہم نیرنگِ قدرت کی بہار
باعثِ حیرت ہے رنگینی تری ہم کیا کہیں — پھول اک اڑتا ہوا یا باغ چھوٹا سا کہیں
کر رہی ہیں رنگ یا خود سیر دوشِ باد پر — ٹکڑے یا قوسِ قزح کے اڑتے آتے ہیں نظر
اڑتے پھرتے دیکھتے تجھ کو ہوا میں شاد شاد — اک عجب حسرت سے بچپن کی ہمیں آتی ہے یاد
سخت کوشش پر ہماری ہاتھ کب آتی تھی تو — تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اُڑ جاتی تھی تو
معترف ہوتے تھے چالاکی کے تیری دمبدم — اور ہوا پر تجھ کو پہروں تاکتے رہتے تھے ہم
آہ وہ دن کیا ہوئے جب رنج سے ہم دور تھے — تتلیوں سے بھی سوا معصوم تھے مسرور تھے
اب نہ وہ اگلی سی آزادی نہ وہ اگلا سا دل — ہاں فقط ہے گردشِ ایام و طبعِ مضمحل
اب کہاں ننھا سا دل اور آرزوئے رنگ و بو — صحنِ گلشن میں کہاں اب تتلیوں کی جستجو
ننھی تتلی تیری ہستی کا اگر ظاہر ہو راز — منکشف ہو رشتۂ خلق و خدائے بے نیاز

ہاں وہ محفل اور تھی سامانِ محفل اور تھا
سچ تو یہ ہے اے رواں ہم اور تھے دل اور تھا

پپیہا

وہی تان پھر سنا دے میرے خوش نوا پپیہے
میرے دلربا پپیہے میرے خوش ادا پپیہے
اسی درد مند دل سے اُسی صوت مضمحل سے
تیرے عشق کے تصدق وہی راگ گا پپیہے
مری نیند اچٹ گئی ہے تری صوت جانفزا سے
دل مضطرب ہے بیکل اسے تو سُلا پپیہے
یہ گھٹائیں کالی کالی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے گدگدا رہے ہیں کہ تو کچھ سنا پپیہے
تجھے جس طرح ہے حاصل یہ کمال عشق نیساں
وہی راہ و رسم الفت مجھے بھی سکھا پپیہے
یہ دھرا ہے نسخۂ دل یہ کھلا ہے باب وحدت
جسے پھر کبھی نہ بھولوں وہ سبق پڑھا پپیہے
کوئی روئے گل دکھا دوں کسی سرو سے ملا دوں
ترے اضطراب دل کا ہے علاج کیا پپیہے
تیرا صبر اور توکل تیرا ضبط اور قناعت
تجھے آفریں پپیہے تجھے مرحبا پپیہے
یہ غضب کی آہ و زاری یہ بلا کی بیقراری
تجھے کس کا ہے تصور ارے کچھ بتا پپیہے

حسرت

باغ میں دیکھ کے اکثر گُلِ تر رنگا رنگ
دلِ پژ مردہ میں میرے بھی یہ آتی ہے اُمنگ
کاش ان پھولوں میں اک پھول مجھے مل جاتا
نذر ہوتی بری جان صدقے مرا دل جاتا
مگر آتا ہے پھر اپنے گُلِ سادہ کا خیال
گُلِ رنگیں سے نہ ہو جائے مرا گل پامال
حسنِ صورت نہ سہی سیرت معقول تو ہے
رنگ خوش رنگ نہیں پھول مرا پھول تو ہے

غزلیات

یارب نہ ہو کسی کو یوں حرص آرزو بھی
ارمان بھی نہ نکلا دل ہو گیا لہو بھی

اس دل کو کیا کہوں میں ضدین کا ہے طالب
لذت تلاش کی ہے ملنے کی آرزو بھی

دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں اہلِ باطن
چاکِ جگر بھی چاہوں کرتا رہوں رفو بھی

اب شیشہ و سبو کیا ساقی بھی رو رہا ہے
رونق تھی میکدہ کی مستوں کی ہاؤ ہو بھی

تسکین قلب مضطر فکر تلاش سے تھی
لیکن رواں مٹا اب وہ لطف جستجو بھی

عجیب قسم کی بجلی نگاہِ یار میں ہے
کہ جل بجھے یہ ہوس قلب بیقرار میں ہے

گلوں کو صرف نہ کر پیار اے مرے جویا
کہ میرے حسن کا جلوہ ہر ایک خار میں ہے

حرارت تپش ہجر اے معاذ اللہ
اک آفتابِ قیامت ہر اک شرار میں ہے

طلسم وعدۂ فردا کے توڑنے والے
تجھے خبر نہیں کیا لطف انتظار میں ہے

کسی کو تاب نہیں دید روے جاناں کی
رواں غریب ستم دیدہ کس شمار میں ہے

لب تبسم ریز چہرہ شاد دل بہکا ہوا
جا رہا ہوں کس طرف کس رنگ میں ڈوبا ہوا

نزع میں آ کر کھلا ہے عالمِ فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

اور اب کوئی ورق اے کاتبِ قدرت الٹ
اس کو کیا دیکھوں جو ہے سو بار کا دیکھا ہوا

ہم نشیں فصلِ بہاری میں مزاجِ دل نہ پوچھ
تو نے دیکھا ہے کبھی دریا کوئی بڑھتا ہوا

یہ بھی کیا کم ہے مری تسکینِ خاطر کے لیے
اٹھ گیا ہے وہ بھری محفل سے شرمایا ہوا

غم نہ تھا اس کا کہ مجھ پر غیر کرتے تھے ستم
جانتا تھا میں جنھیں ہمدرد اُن کو کیا ہوا

جو نہ ہو جائے وہ تھوڑا ہے رواں اس دور میں
رنگ ہی دنیا کا ہے کچھ آج کل بدلا ہوا

گُل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا
تو ہی دیکھ اے مرے خلاق حسن رائیگاں میرا

یہ کہہ کر روح نکلی ہے تنِ عاشق سے فرقت میں
مجھے عجلت ہے بڑھ جائے نہ آگے کارواں میرا

ہوا اُس کو اڑا لے جائے اب یا پھونک دے بجلی
حفاظت کر نہیں سکتا مری جب آشیاں میرا

زمیں پر بار ہوں اور آسماں سے دُور اے مالک
نہیں معلوم کچھ آخر ٹھکانا ہے کہاں میرا

مجھے نغمہ کا لطف آتا ہے راتوں کی خموشی میں
دل بشکستہ ہے اک سازِ آہنگ فغاں میرا

وہیں سے ابتدائے کوچۂ دلدار کی حد ہے
قدم خود چلتے چلتے آ کے رک جائے جہاں میرا

رواں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

فکر عقبیٰ کی کریں ہم یا غمِ دنیا کریں
عقدۂ ہستی کو کس ناخن سے آخر وا کریں

ایک عالم محوِ نظارہ ہے اور وہ پردہ دار
گر اسی کا نام پردہ ہے تو وہ پردا کریں

اپنے دامن میں بھرے بیٹھے ہیں خاک کوئے دوست دل کے ذروں کو ارادہ ہے کہ پھر یکجا کریں
اس دل مردہ کا حال اے ہم نشیں ہم سے نہ پوچھ ہم پہ جو گزری سو گزری ان کو کیوں رسوا کریں
پھر غنیمت تھے وہ ہنگامے جنونِ عشق کے جب سے آئے ہوش میں یہ فکر ہے اب کیا کریں
جانے والے چل دیے دنیا کی بستی چھوڑ کر رونے والے ایک دن کیا عمر بھر رویا کریں
ان کے آتے ہی تڑپ کر مر گیا بیمار غم یہ حد تدبیر تھی تقدیر کو ہم کیا کریں
جب فنا ہونا یقینی ہے دلی جذبات کا یاس کا غم کامیابی کی مسرت کیا کریں

ایسے بھی کچھ نالہائے قلب مضطر ہیں رواں
جو فضائے آسماں میں حشر تک گونجا کریں

کسی طرح نہ مرے دل کو جب قرار آئے مری بلا سے خزاں آئے یا بہار آئے
کسی سے عالم فطرت کا یہ تقاضا ہے جدھر نگاہ کرم ہو ادھر بہار آئے
نفس نفس متغیر ہے عالم فانی کسی کو آئے تو کس طرح اعتبار آئے
ترے کرم کے تصدق ترے کرم کے نثار امیدوار گئے ہم امیدوار آئے
نجات روح کو ہستی کی کشمکش سے کہاں عدم میں جا کے فقط نیستی اتار آئے

وہ بادہ نوش حقیقت ہے اس جہاں میں رواں
کہ جھوم جائے فلک گر اسے خمار آئے

لہو میں ڈوب کر نکلی ہے دل سے یہ فغاں سن لے مددگارِ غریباں دستگیرِ بیکساں سن لے
سنے ہوں گے ہزاروں قصہ ہائے دردوغم تو نے خداوندا، کبھی مجھ سے بھی میری داستاں سن لے

کوئی آخر کبھی فریاد رس ہوگا غریبوں کا زمیں والے نہیں سنتے تو ہی اے آسماں سن لے
کہو آہستہ رکھیں زخم دل پر چارہ گر مرہم قیامت ہو اگر یہ حال مضحک میہماں سن لے
سنا ہے سننے والے درد کی آواز سنتے ہیں نہ کر یہ اضطرابِ قلب میرا رائیگاں سن لے
چمن سے دُور لے جا کر مجھے صیاد دفنانا کہیں ایسا نہ ہو میرا رفیقِ آشیاں سن لے

میں گھٹ کر جان تک دے دوں تو کوئی بھی نہ پرساں ہو
جو منہ سے اُف نکل جائے ابھی سارا جہاں سن لے

قطعات

وہ اک کمزور لمحہ جب یہ دل شیدائے عصیاں تھا
خلل تھا عقل میں اور دل میں زہر آلود پیکاں تھا
تعجب خیز ہیں اب تک یہ حسن و عشق کے رشتے
مدار زیست تھا جو فی الحقیقت دشمنِ جاں تھا

قدرت نے دل کو مرجِ عرفاں بنا دیا
ہر خارِ زار کو چمنستاں بنا دیا
کیا جلد طے ہوئی ہیں ترقی کی منزلیں
آزادیٔ خیال نے انساں بنا دیا

تو ملے گر تو مرا شوق ہو محدودِ جمال
اور شرمندۂ دیدار ہو صورت تیری
یہ نہ ملنا بھی عنایت سے نہیں ہے خالی
کہ نہ پابند طریقت ہو حقیقت تیری

آپ تیار ہیں کرنے کو ہر اک پر احساں
شرط یہ ہے کہ کوئی آپ کا نقصان نہ ہو
مجھ کو رحم آتا ہے اس عہد کے نیکوں پہ رواں
اتنا گمراہ وفا بھی کوئی انسان نہ ہو

لٹ گیا اسباب عشرت پُرخطر ہیں منزلیں
اے گرفتارِ غلامی دیکھ اب تو سر اٹھا
اُف بری غفلت کہ اب بھی محوِ آسائش ہوں میں
بزمِ ہستی سے یہ آتی ہے صدا بستر اٹھا

ہوس ہی آدمی کی دشمنِ اقبال و ایماں ہے
ہوس ہی سے یہ خارستان دنیا اک گلستاں ہے
یہیں پر آرزوئیں دفن ہیں اور حسرتیں زندہ
ہمارے دل کی بستی عالمِ گورِ غریباں ہے

دماغ ملک کا احساس گر بیدار ہو جائے
قرینِ مصلحت ہر غافل و ہشیار ہو جائے
پھنسی ہے آکے گردابِ فنا میں قوم کی کشتی
کوئی تدبیر کر یارب کہ بیڑا پار ہو جائے

جہانِ عشق میں بیہوشیوں کی انتہا جو ہے
وہیں سے عالمِ عقل و خرد کی ابتدا سمجھو
علاجِ درد کا جب تک دل غافل رہے طالب
وہی حد ہے کہ جب تک تم مرض کو لا دوا سمجھو

مری قسمت مری دنیا کو زنداں کر کے چھوڑے گی
یہ ہر اک پھول کو خارِ مغیلاں کر کے چھوڑے گی
کہاں وہ حسن معصوم اور کہاں تر دامنی دل کی
مری ہمت مجھے اک دن پشیماں کر کے چھوڑے گی

مجھے اکسیر میری آہ سوزاں کر کے چھوڑے گی
قناعت میری درد دل کو درماں کر کے چھوڑے گی
تہیہ ہے کہ اب یا میں رہوں یا کفر کمزوری
عقیدت ورنہ بے دینی کو ایماں کر کے چھوڑے گی

میں ان کے ظلم پر فریاد کیا اف تک نہیں کرتا
وہ ناداں ہیں جو اس کو میری کمزوری سمجھتے ہیں
جفا پر فخر ان کو ہے وفا پر اپنی میں نازاں
وہ اپنی کامیابی ، فتح ہم اپنی سمجھتے ہیں

میں جو کہتا ہوں کہ موت آئے تو مرجانے دو
اس تخیل کی حقیقت مجھے بتلانے دو
اصل یہ ہے کہ مرا دل ہے غمِ دہر سے چُور
اور اتنا کہ نہیں اب مجھے جینا منظور

جسے سب کہتے ہیں راحت وہ بس اک حالتِ دل ہے
نہ ظاہر ہے نہ مخفی ہے نہ آساں ہے نہ مشکل ہے
ہنسی کے ساتھ آنکھوں میں چھلک آتے ہیں آنسو بھی
کہ ہر راحت کے ساتھ اک ماجرائے غم بھی شامل ہے

رباعیات

اُف اے دلِ مضطرب یہ حالت تیری
پیچیدہ ہے کس قدر حقیقت تیری
مرکز ہے امید و حسرت و یاس کا تو
رو دیتا ہوں دیکھ کر مصیبت تیری

تدبیر پہ منحصر نہ اوقات پہ ہے
انجامِ عمل خدا ہی کی ذات پہ ہے
یہ کوشش نامراد کہتی ہے رواں
تقدیر کی راہ اتفاقات پہ ہے

حرص و ہوسِ حیاتِ فانی نہ گئی
اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں
مر کر بھی امیدِ زندگانی نہ گئی

آلودۂ معصیت ہے دامن میرا
جل جانے کا مستحق ہے خرمن میرا
بیکار ہے شکوہ اہلِ دنیا کا رواں
بڑھ کر نہیں کوئی مجھ سے دشمن میرا

حسرت نہ رہی کہ یاس و کلفت نہ رہی
کیا کیا دلِ بوالہوس پہ آفت نہ رہی
اب حاصلِ آرزو ملا بھی تو کیا
جب قلب میں قوتِ محبت نہ رہی

برعکس امیدوں کے نتیجے میں یہاں
یہ کوششِ نامراد کہتی ہے رواں
اعضائے عمل تھکے ہیں شل ہے تدبیر
مجبور ہے کتنا ، کتنا بے بس انساں

آزاد ضمیر ہو ، فقیری یہ ہے
دل بے پروا رہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعثِ قید رواں
محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

کل کہتے تھے جس کو دل کی راحت یہ ہے
ہے آج جدا وہ کیا قیامت یہ ہے
یہ جان کے بھی کہ موت سر پر ہے کھڑی
انسان ہے محوِ عیش حیرت یہ ہے

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
اک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی

پندار سے اپنے سوگوار آیا ہوں
اعمال سے اپنے شرمسار آیا ہوں
اے بخشنے والے سب گنہگاروں کے
مایوس نہ کر امیدوار ہوں آیا ہوں

آئینۂ اضطرابِ دل ہے دنیا
ظاہر میں اگرچہ پا بہ گِل ہے دنیا
ہر وقت گریز پا ہے نیرنگِ نمود
کہتا ہے یہ کون مستقل ہے دنیا

غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں
رازِ فطرت کسی کو معلوم نہیں
سب محوِ خیالِ اہلِ دنیا ہیں رواں
اپنی قیمت کسی کو معلوم نہیں

اپنی اوقات مفت میں کھوتا ہوں
اپنی ہی نظر میں خوار خود ہوتا ہوں
اے داورِ حشر آہ ! میرے اعمال
دنیا ہنستی ہے اور میں روتا ہوں

کچھ وقت اگر خوشی میں کٹ جاتا ہے
تسکین ہوتی ہے رنج بٹ جاتا ہے
اکثر تو کچھ ایسا حال ہوتا ہے رواں
بالکل دنیا سے جی اچٹ جاتا ہے

تخریبِ حیات میں ہے تعمیرِ حیات
ہے باعثِ انحطاط ، تدبیرِ حیات
شیرازۂ دو جہاں ہے تشریحِ فنا
کڑیاں لاکھوں ہیں، ایک زنجیرِ حیات

افسانہ

انارکلی

''نادرہ'' اکبر کے حرم سرا کی ایک کنیز کی لڑکی کا نام تھا۔ایک بار بادشاہ نے اُس کو اِس نام سے یاد فرمایا تھا اور آج تک وہ اسی ''انارکلی'' کے نام سے زندہ ہے۔انارکلی ایک کمسن، حسین، مہ جبین، چنچل اور چلبلی لڑکی تھی۔اس پر محل شاہی کی بیگمات کی نظر عنایت تھی اور شاہی حرم سرا کے احاطہ کے اندر وہ ایسے پھرا کرتی تھی جیسے فصل بہار میں تتلی پھول سے باغ کے اندر پھولوں کی بہار لوٹتی ہے۔

انارکلی کب تک بند رہ سکتی ہے؟ آفتاب کی روز افزوں کرنیں اپنے نازک اور ملائم ہاتھوں سے اُسے کھولنا شروع کرتی ہیں، اور حسن اور خوشبو کے اس بند خزانے کو کھول کر لٹا دیتی ہے۔یہی حال انارکلی کا بھی ہوا۔زندگی کے ایام بہار کی آمد نے اس کے حُسن میں شباب کی آب وتاب پیدا کردی تھی۔ابھی چار دن ہوئے وہ بالکل الھڑ تھی اور آج امنگ بھری جوانی اس پر پھول رہی تھی۔ بچپن کی وہ شوخی رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگی اور جوانی کی سنجیدگی اور دلچسپ متانت اس کی جگہ لینے لگی۔اس کے سادے اور بھولے تبسم میں قیامت کی دل آویزی آگئی اور اس کی کالی اور نشیلی آنکھوں میں ایک دل ربایانہ انداز کی شوخی جھلکنے لگی۔شباب نے گدگدا کر اُس کو اور بھی شوخ بنا دیا تھا اور امنگوں سے متوالی وہ اپنے جذبات حُسن افزا میں ترقی کرنے لگی۔

حرم شاہی کی معمر عورتیں انارکلی کی جوانی کا اُبھار دیکھ کر اور اس کی دلفریب اداؤں سے متاثر ہوکر آہیں کھینچنے لگتی تھیں کیونکہ انارکلی کی یہ حالت ان کو اپنی جوانی کی یاد دلاتی تھی۔ کبھی انارکلی کی ہم عمر سہیلیاں انارکلی کو چہکتے دیکھ کر کہہ اٹھتی تھیں۔

"اچھا اب انارکلی بھی کھل چلی" اس کا جواب انارکلی ایک دلفریب تبسم کے ساتھ یوں دیا کرتی تھی۔ "پھر کیوں نہ کھلے"

دوئم

اب انارکلی کے ناز و کرشمہ کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے کی نظر پڑی اور دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ آخر اس کے اس حسن بلاخیز نے شاہزادہ سلیم پر بھی جادو ڈالا۔ سلیم بے قرار تھا کہ کیوں کر وہ اپنے دل کی اس بے قراری کا حال انارکلی کے گوش گزار کرے۔

رات کا وقت تھا۔ صاف چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ دونوں خلوت میں ملے۔ پانی کے ہلکے چھینٹے نے درختوں اور پھولوں سے گرد و غبار دھو دیا تھا۔ اور موتیا کی بھینی خوشبو سے تمام باغ اڑا جا رہا تھا۔ درختوں کی پتیوں سے پانی معطر ہوکر گر رہا تھا۔ اور باقاعدگی کے باعث ان گرنے والی بوندوں کی آواز میں نغمہ کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ بادل رفتہ رفتہ ہٹ رہے تھے اور چاند کی بے باک کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر بلند ہوگئی تھیں۔ انارکلی سنگِ سفید کے فرش پر ٹہل رہی تھی اور اپنے چھوٹے ہرن کے بچے سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ "آرا۔۔آرا۔۔۔" یہ الفاظ اس کے ہونٹوں اور سُریلے گلے سے نکل کر ہوا کی موجوں پر تیرتے ہوئے دور تک چلے جاتے تھے۔ اور شام کے سکون میں ایک راحت انگیز راگنی کا لطف دے رہے تھے۔

انارکلی کی اس سریلی آواز کے جواب میں ایک ہلکی سی جھنکار سنائی دی۔ پھر اس نے "آرا۔۔آرا۔۔۔" پکارا۔ پھر وہی جھنکار کانوں میں پڑی کبھی وہ آواز دور معلوم ہوتی تھی اور کبھی پھر نزدیک ہو جاتی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ ہرنی اس کی آواز سُن رہی تھی ورنہ جواب کیسے دیتی۔ لیکن وہ کہاں؟ آواز سنتے ہی ہرنی عموماً اُچھلتے کودتے دوڑ آتی تھی۔

پھر انارکلی نے آواز دی۔اور پھراسی قسم کا جواب ملا۔انارکلی آگے بڑھی اور باغ کی اس آواز کی آہٹ پر جا پہنچی جہاں سے جھنکار کی آواز آتی معلوم ہوتی تھی۔ایک قریب دردانگیز آواز سے انارکلی نے کہا۔''ابھی تک تو کہاں تھی۔''

ہرنی فوراً اُچھل پڑی۔اور ایک درخت کے نیچے سے چھلانگیں مارتے ہوئے آموجود ہوئی۔ شام کی خاموشی میں اس کے گلے کی گھنٹی کی آواز تیرتی ہوئی نکل گئی۔انارکلی نے جھک کر ہرنی کی گردن میں اپنی نازک اور گول بانہیں ڈال دیں۔تب عاشقانہ انداز سے بولی۔''کیوں ری سن ہرنی تو ابھی تک کہاں تھی۔تجھے کس نے روک رکھا تھا۔''

''میں نے۔''

انارکلی چونک پڑی۔پھر کر دیکھنے لگی کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔انارکلی ڈر گئی۔اسے کیا معلوم کہ اس کے پیچھے شہزادہ سلیم کھڑا ہے۔شہزادہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''میں تمھاری ہرنی کو نہ جانے دوں گا۔''انارکلی کے چہرے پر شرمندگی کی سُرخی جھلکنے لگی۔اس نے جلدی سے نقاب سنبھالی اور تعظیم بجالائی۔

انارکلی نے دبی زبان سے رُک رُک کر کہا۔''حضور میری خطا معاف کریں، مجھے معلوم نہ تھا۔''

درمیان ہی میں شہزادہ نے بات کاٹ کر کہا۔''نہیں مجھے آپ سے معافی مانگنا چاہیے۔کیونکہ میں نے بلا آپ کی اجازت آپ کی ہرنی کو دیر تک جانے نہیں دیا۔''

شہزادہ کے اس رازدارانہ انداز اور ہچکچتی آواز میں کچھ بات تھی جس نے انارکلی کو شرمندہ کر دیا۔

سلیم نے پھر کہا''آپ جانتی ہیں کہ میں نے اس ہرنی کو روک رکھا تھا۔''یہ کہتے کہتے شہزادہ آگے بڑھا اور انارکلی کے کان میں چپکے سے کہا۔''محض اس وجہ سے کہ اس کی آنکھیں تمھاری آنکھوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔''

انارکلی نے سن کر جواب نہ دیا۔کچھ روز ہوئے اس کو معلوم ہوا تھا کہ شہزادہ سلیم انارکلی سے محبت کرتا ہے۔اب اس کے شُبہ کو یقین کا درجہ نصیب ہو چکا تھا۔اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر

اٹھی۔ جس نے اس کی زبان نہ کھلنے دی۔

سلیم اس کے پاس کھڑا تھا اور انارکلی کی طرف ہنستی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ نادرہ نے بھی نظر اٹھائی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ نادرہ کے ہونٹوں پر بھی شرمیلی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ سلیم نے آہستہ سے نادرہ کے جسم پر ہاتھ رکھا اور پھر اسے اپنی آغوش محبت میں کھینچ لیا۔

''میری مایہ حیات! تم میری ہو۔ اور فقط میری ہو۔''

پہلی بار نادرہ کے ملائم ہونٹوں نے بوسہ کی لطیف حرارت محسوس کی اور جب سلیم اپنے دونوں ہاتھ نادرہ کی گردن میں ڈالے کھڑا تھا تو نادرہ ہوا سے اُڑتے ہوئے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ ہرنی یک بارگی بھڑک کر چل دی جیسے خواب سے چونک پڑی ہو۔ چلتے چلتے ہرنی کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے موتی آنسو ہو کر نکل پڑے۔ اور اس صاف چمکتی ہوئی زمین پر گر گر ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔

سوئم

اس رات انارکلی کو نیند نہ آئی۔ خوشی کے مارے اُسے نیند نہ آتی تھی۔ اسے رہ رہ کر شام کے واقعات یاد آتے تھے۔ شہزادہ نے اس سے عشق کا اظہار کیا تھا۔ یہ عجیب خلاف امید خوشی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر عجب راحت افزا سکون طاری تھا۔ آنکھ بند کیے وہ بستر پر لیٹی رہی لیکن سو نہ سکی۔ اس نیم خوابی کی حالت میں وہ اس جاں بخش سکون کا مزہ لیتی رہی جو آج اس کے دل پر طاری تھا۔ شام کے واقعات کو اس نے اپنے دل میں ایک ایک کر کے دوہرانا شروع کیا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس کے دماغ کے پردوں پر نقش ہو گئی تھی۔ اور شہزادہ کی عاشقانہ انداز سے بات چیت کرتی ہوئی تصویر اس کی نگاہ کے سامنے آموجود ہوئی۔

سلیم کا وہ خطاب کرنا۔ اس کے دل میں خوشی کے مارے گدگدی پیدا ہونا۔ شہزادہ کی آواز میں وہ عاشقانہ جوش اور لطافت اپنا حجاب آلودہ انداز شہزادہ سے بات کرتے وقت جو رعشہ اس کے

جسم پر پڑ گیا تھا۔ وہ دونوں کی نگاہوں کا ملنا۔ شہزادہ کی آنکھوں کا وہ رسیلا پن۔ شہزادہ کے رخساروں کی تابش جس نے انارکلی کی آنکھوں کو کھرا کر دیا تھا۔ اور سب سے زیادہ وہ خوش دل، خوش کن وقت اور جب دونوں کے ہونٹ گویا خود بخود ایک دوسرے کے ہونٹوں سے مل گئے تھے۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کے دل بھی ہونٹوں پر آ کر ایک دوسرے سے ملنے اور مزہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کی یاد نے انارکلی کے رخساروں پر گلاب کے پھول سی تازگی پیدا کر دی۔ وہ پھر اپنے دل میں جذبات کی حرارت محسوس کرنے لگی۔ پھر اس کا دل ایک مجنونانہ جوش سے دھڑکنے لگتا تھا اور ایک بار پھر اس کے دل میں راحت بخش جذبات موجیں مارنے لگتے تھے۔ جس کے دل میں ایسا محشرستان خیال ہو وہ کیسے سو سکتا ہے۔

عشق۔ ہاں عشق تھا۔ شہزادہ نے انارکلی سے عشق کا اظہار کیا تھا۔ یہ بہت تعجب خیز بات تھی۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ انارکلی اس سوال کا جواب اپنے اطمینان کے موافق نہ دے سکتی تھی۔ کیا واقعی وہ خوب صورت تھی۔ اسے یقین آ چلا تھا کہ وہ واقعی حسین ہوگی۔ ورنہ شہزادہ سلیم اس پر عاشق ہی کیوں ہوتا۔ ان خیالات نے جمع ہو کر اس کے دل پر خود بینی کا گہرا رنگ چڑھا دیا۔ "کسی کے آغوشِ الفت میں زندگی بسر کرنا!"

آہ! اس خواہش نے اس کے دل کو ارمانوں کا گنجینہ اور آرزوؤں کا خزانہ بنا دیا تھا۔ باہمی محبت اور عشق، یہ دونوں ایک تازہ پھول کی صورت میں اس کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوئے۔ سلیم میرے ساتھ نکاح کرے گا۔ اور اس خواب راحت کی حالت میں ہم لوگ کتنی ہی بعید از قیاس منازل الفت و محبت طے کر جائیں گے۔ آہ! کتنا اچھا ہوگا وہ وقت۔ کاش جلد آ جاتا۔

وہ ایسے ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور ایسی ہی آرزوؤں سے اس کا دل لبریز ہو رہا تھا۔ وہ ہر لحظہ ایک نئے انداز کی خوشی محسوس کرتی تھی اور اپنی خوشی کے مزے لے رہی تھی۔

ادھر سلیم کی راتیں بھی بے چینی میں کٹنے لگیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا.... اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ لیکن شاید معصومیت اور عنفوان شباب کو عشق و محبت سے کچھ خاص مناسبت ہے۔ اس عمر میں

عشق ناپاک جذبات سے پاک ہوتا ہے اور ارمانوں اور آرزوؤں میں معصومیت ہوتی ہے۔

میدانِ محبت میں شہزادہ سلیم کا یہ پہلا قدم ہی تھا۔ انارکلی کے حسن دل افروز نے جو اثر اس کے دل پر ڈالا اسے پہلے کبھی اس نے محسوس نہ کیا تھا۔ آہا! کیسی دلکش حسین اور پھولتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ کیسی دلکش آواز جس پر سُر یلے نغمے نچھاور ہیں۔ کیسے گلابی ہونٹھ ایسی ہی باتوں کا تصور کرتے کرتے شہزادہ کی بے چینی بڑھ گئی اور ایک بے قرارانہ نیم خوابی کی حالت میں وہ سو گیا۔

چہارم

اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد دولت سرائے شاہی میں ایک جلسہ ہوا۔ رقص و سرود کا انتظام تھا۔ سلیم اکثر شام کا وقت رقص و سرود کی محفلوں میں گزارتا تھا۔

ارباب نشاط میں انارکلی کا نمبر اول تھا۔ کیا پیارا انداز تھا۔ کتنی سُر یلی آواز پائی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اکبر کی آنکھ کی پتلی ہو رہی تھی۔ اس کی محفلیں بغیر انارکلی کے سونی رہتی تھیں۔ اور خود جہاں پناہ کے منظور نظر ہونے کے باعث اس کا گانا بادشاہ کی محفل کے سوا کہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ جب کبھی بادشاہ سلامت بیگمات میں وقت گزارنے کا قصد کرتے تو انارکلی وہاں ضرور موجود ہوتی۔

شیش محل میں روشنی کا انتظام ہوا۔ رنگا رنگ جھاڑ فانوس آئینوں میں منعکس ہو کر اپنی جگمگاتی روشنی سے ایک دل آویز کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرہ ایک طلائی زیور ہے جس میں تمام رنگا رنگ جواہرات جڑے ہیں۔ صحن میں کمخواب قاقوم کا فرش لگا ہوا ہے۔ صدر میں مسند زریں پر بادشاہ سلامت بہ نفس نفیس تشریف فرما ہیں۔ حفظ مراتب کے ساتھ جا بجا فرش پر ملائم گدوں اور مسند پر گاؤ تکیہ کے سہارے معشوقانہ انداز سے بیگمات جلوہ افروز ہیں۔

گانا شروع ہو چکا تھا۔ کچھ رامشگرانِ دلنواز نے بادشاہ کی سامعہ نوازی کی تھی۔ لیکن انارکلی اب تک رونق آرائے محفل نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد انارکلی کی باری آئی۔ انارکلی حاضر ہوئی۔

ادائیں موہ چھل بلا رہی تھیں ۔ اورحسن صل وجل کہہ رہا تھا۔ ایک انداز محبوبانہ کے ساتھ انارکلی نے فاصلہ پر مودبانہ کھڑے ہوکر بادشاہ کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ اس کی پوشاک ارغوانی رنگ کے مخمل کی تھی۔ جس پر زردوزی کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے بالوں میں اس کے خوب صورت گلے میں اس کی عام پوشاک میں جواہرات جلوہ دکھا رہے تھے۔ وہ یوں ہی بے حد خوب صورت تھی لیکن آج اس پوشاک اوران زیوروں نے اس کے حسن کو اور چار چاند لگا دیے تھے۔

بادشاہ نے نظر اٹھا کر انارکلی کی جانب دیکھا۔ تب ایک متبسم انداز سے فرمایا۔ انارکلی! چاند کو تاروں پر فتح پانے کے لیے آرائش کی ضرورت نہیں ہے۔

انارکلی نے معشوقانہ انداز سے شرما کر سر جھکا لیا۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا اس کو بادشاہ کے روبرو کیسے کہہ سکتی تھی۔ سلیم محفل میں موجود تھا۔ پھر آج اچھی سے اچھی پوشاک کیوں کر نہ پہنتی۔

سارنگی کی مدھم اور سریلی آواز رفتہ رفتہ محفل شاہی میں بلند ہوئی۔ جیسے ہی تمہیدی ساز ختم ہوا اس نے ایک غلط انداز نگاہ استاد پر ڈالی۔ اور تب اپنا داہنا پاؤں گت ناچنے کے لیے بڑھایا۔ انار کلی کے گھونگھرو کی آواز نے سامعین کے دلوں میں سنسنی پیدا کر دی۔ تمام محفل میں سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے میں انارکلی کے گھونگھرو کی آواز ناچتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ اس طرح آہستگی اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتی تھی جیسے خواب میں انسان حرکت کرتے ہیں۔ پھر گھونگھرو بجے۔ اور پھر سارنگی کی بلند ہونے والی آواز نے انارکلی کی آواز کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ تب دبی آواز سے انارکلی نے گانا شروع کیا۔ اس کی آواز نازک تھی۔ اور نغمہ کی لطافت سے مالا مال۔ کبھی کبھی وہ ایسے مدھم سروں میں گانے لگتی تھی کہ اس کے گانے کا یقین صرف اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد رفتہ رفتہ آواز سنائی دینے لگی۔ آواز میں وہ کیفیت تھی جو چاندنی رات کے سناٹے میں کسی خوش گلو پرند کے گانے سے ہوتی ہے۔

آج انارکلی کو گانے میں ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ آج اس کو اپنی ہستی ایک خواب کی سی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔ جس میں سوائے اس کی محبت کے اور کوئی چیز دیر تک رہنے

والی نہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اور اس کی آنکھیں سلیم کی آنکھوں سے لڑ گئیں۔ سلیم انارکلی ہی کو دیکھ رہا تھا۔ سلیم کی خوب صورت اور بڑی آنکھوں میں ایک دلفریب محویت جھلک رہی تھی۔ انارکلی کے دل میں گزشتہ چند ملاقاتوں کی یاد دفعتاً تازہ ہوگئی۔ کیونکہ اس شام کے بعد عاشق اور معشوق اکثر مل چکے تھے۔ اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار پیدا تھے۔ اور اس کی آنکھیں فرط نشاط سے مسکرا رہی تھیں۔

ادھر سلیم کو دیکھئے۔ آج انارکلی ایک فرشتۂ حسن معلوم ہوتی ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ اُف! کس غضب کا حسن ہے اور کس قدر دلکش ادائیں ہیں۔ اس کی نگاہیں سلیم کے کلیجے میں اُتری جا رہی ہیں۔ اس نے بلند آواز سے گانا شروع کیا۔

من تو شدم۔ تو من شدی۔ من تن شدم۔ تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ شعر گاتے گاتے اس کے دل میں ایسے خیال موجزن ہونے لگے جن کا اس کو گمان بھی نہ تھا۔ کیا اچھا موقع ہے۔ معشوق اپنے عاشق کے سامنے دلی جذبات کو دلکش پیرائے میں گا کر ادا کرتا ہے۔ اور جذبات بھی کیسے جو کچی محبت کے گہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور دل میں سما جانے کے پہلے دل کے ٹکڑے، بن بن کر باہر نکل رہے تھے۔ کیا اچھا موقع تھا۔ اس خیال نے انارکلی کو از خود رفتہ کر دیا۔ اسے یاد نہ رہا کہ وہ محفل شاہی میں حضور جہاں پناہ کے روبرو گا رہی ہے۔ اس کو وہ محفل وہ وقت بھی بھول گیا۔ اسے سب کچھ بھول گیا۔ اس کے دل میں صرف ایک راحت افزا خیال باقی رہ گیا۔ وہ اپنے آپ کو اس وقت ایسی محفل میں سمجھ رہی ہے جس میں اس کے عاشق زار سلیم کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی نور بن کر جھلک رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے ایک مغرورانہ ناز پیدا تھا۔ اور اس کا چہرہ ایک خاص روشنی سے منور تھا۔ تب ایک نازک اور دل رُبایانہ انداز سے وہ شہزادہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی۔

اتنے میں بادشاہ نے ایک خشمناک بلند اور رعب دار آواز میں کہا:

''گانا بند کرو مغنیہ۔'' فوراً گانا بند ہوگیا اور غضب ناک خاموشی طاری ہوگئی۔ بادشاہ کی پیشانی اور آنکھوں سے غصہ کے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے سامنے والے آئینہ میں راز و نیاز کی جلوہ نمائیاں اور دل فروشیاں جو سلیم و انارکلی میں ہورہی تھی وہ ان کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ برابر آئینہ پر نظر جمائے ہوئے ان کے خیالوں کا اندازہ لگانے میں مشغول تھا اور ان سرمستان محبت کی آنکھوں سے جذبات الفت کے جام چھلک رہے تھے جن کی خود بادشاہ کو مطلق خبر نہ تھی۔ وہ ان کو بغور دیکھتا رہا۔ اور ہر انداز اس کے شبہ کو یقین کی طرف کھینچے لیے جارہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب انارکلی سلیم کو دیکھ کر مسکرادی۔ اور سلیم نے برابر اس کے جاذبانہ تبسم کا جواب تبسم میں دیا۔ اب بادشاہ کو معلوم ہوگیا کہ آسانی سے سلیم اس وار کو بچا نہ سکے گا۔

گو خلقتاً بادشاہ بہت حلیم اور متحمل مزاج واقعہ ہوا تھا لیکن آج اس کا غصہ قابو سے باہر ہوگیا تھا۔ اس خیال نے کہ شہزادہ ایک غلام زادی کے جال میں پھنس کر خراب ہوا جارہا ہے۔ اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ جانتا تھا کہ اس خطرہ سے سلیم کو بچانے کے لیے صرف زبان ہلانے کی دیر ہے۔ ایک صاف اور غضب ناک آواز سے اس نے خواجہ سراؤں کے افسر کو بلایا۔

غصہ سے کانپتی ہوئی انگلی انارکلی کی جانب اٹھا کر بادشاہ نے کہا:

''اس عورت کو لے جاؤ۔ اسے زندان میں قید کردو۔ کل صبح کو اس کی زندہ کھال کھنچوائی جائے گی۔ ایسی شریر اور بے تمیز عورتوں کی یہی سزا ہے۔ جن کو یہ سلیقہ نہیں ہے کہ ان کو اپنی اداؤں کا جال کہاں ڈالنا چاہیے۔''

بادشاہ کے یہ الفاظ اس خاموشی اور سجے ہوئے کمرہ میں گونج اٹھے اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر دم بخود رہ گیا۔

ادھر انارکلی نے بھی پھر کر بادشاہ کی جانب دیکھا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا اشارہ اسی کی جانب تھا تو اس کا خون سرد ہوگیا۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ بادشاہ کے اس حکم کا کیا مطلب ہے۔ اسے کمرہ کے اندر کسی کو خوف دلانے والی آواز میں بات چیت

کرتے سنا اور ابھی وہ اچھی طرح اس کو سمجھنے نہ پائی تھی کہ کمرے کی تمام روشنی گل ہو گئیں۔

آہستہ سے اس کا شانہ کسی نے پکڑا یہ خواجہ سرا تھا جس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اب اسے لے جا رہا تھا۔ انارکلی کے آنکھوں اور چہرے سے ایک قابل رحم مایوسی برس رہی تھی۔ وہ دبی زبان سے رونے لگی۔ وہ بہت زور سے چیخ کر روئی اور ایک بے تابانہ جوش سے خواجہ سرا کے پنجہ سے ہاتھ چھڑا کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑی۔ جیسے کسی تازہ پھول کو کسی شاخ سے توڑ کر مل کر پھینک دیا گیا ہو۔

پنجم

جب انارکلی نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو عجب عالم میں پایا۔ رات بڑی اندھیری تھی۔ اور چاروں طرف دل شکن خاموشی طاری تھی۔ رات کی سیاہی ایک بجھتے ہوئے چراغ کے سنبھالا لینے کے باعث اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اور رات کا سناٹا دور بولنے والے پرندوں کی آواز سے لڑ کر اور زیادہ خوفناک ہو رہا تھا۔

انارکلی نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ کہ آخر وہ کہاں ہے۔ کچھ دیر تک وہ کچھ سمجھ نہ سکی لیکن تھوڑی دیر کے بعد گزشتہ شب کے دل ہلا دینے والے واقعات کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ کتنا خوفناک واقعہ تھا۔ اب وہ بحیثیت مجرم کے قید خانہ میں تھی اور کل اس کی جان لیے جانے کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ جب اس نے اس بے دردانہ موت کا جس کا شکار وہ دوسرے دن ہونے کو تھی۔ خیال کیا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ خیال کر کے کہ زندگی کے صرف چند گھنٹے اور باقی ہیں اور بعد اس کے اس کی ننھی پیاری اور معصوم جان نذر اجل کی جائے گی۔ اور اس حسن دلکش اور نگاہ دلفریب کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ ان خیالات نے انارکلی کے چہرہ کو زرد کر دیا تھا اور اس کی تازگی ملاحت چشم زدن میں رخصت ہو گئی۔ جس طرح کوئی شہ زور فربہ اندام بھیڑیا اپنی خوف دلانے والی آنکھوں سے کسی کمزور اور دبلے بکری کے بچی کی جانب گھور رہا ہو۔ اسی طرح موت انارکلی کو

گھور رہی تھی۔ موت یوں ہی خوفناک ہوتی ہے۔ اور انارکلی کی موت ہزار چند زیادہ خوفناک تھی۔ وہ حسن جاں سوز۔ وہ اٹھتی جوانی۔ وہ شہزادہ کی قدر دانی وہ حسرت ناک انجام! موت سامنے نظر آتی تھی اور ہر لحہ قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ کیسی خوفناک موت تھی۔ اور کس قدر بے وقت!

انارکلی اٹھ بیٹھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ جس طرح کوئی چھوٹا جانور، شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر گر پڑتا ہے۔ اسی طرح انارکلی بے بس ہو کر زمین پر گر پڑی۔ کون زمین جیل خانہ کی سخت اور تکلیف دہ زمین، انارکلی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آہ! کیا دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس پر رحم کھاتا۔ جو اس کے بچانے کی فکر کرتا۔ جو اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیتا! سلیم! آہ سلیم جس کے لیے اس کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ وہ سلیم کہاں ہے۔؟ انارکلی رونے لگی اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

انارکلی دیر تک رویا کی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی باقی نہ تھے۔ جب ذرا ہچکیاں رکیں تو اس کو خیالات معلوم ہوئے۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس کے دل میں وہی حالات جن کے باعث آج وہ اس حالت میں تھی۔ یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ اسے تعجب تھا کہ ایسی اس سے کیا خطا ہوئی تھی جس کے باعث اس کو یہ سزا ملی۔ ہاں! خطا تھی یہ کہ اس نے شہزادہ سے دل لگایا تھا۔ شہزادہ سے دل لگانا جرم تھا۔ خطا تھی۔ لیکن انارکلی کو یہ کیا معلوم تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ اس کے دل کی معصومیت کبھی کبھی اس کو اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ کبھی کبھی اس کو اس خیال سے سخت تکلیف ہوتی تھی وہ کہہ اٹھتی تھی، ''میرے خدا! اگر اس خواب کی تعبیر یہی تھی تو مجھے وہ خواب نظر ہی کیوں پڑا۔ اگر حصول مدعا ناممکن تھا تو اس دل میں ایسی خواہش ہی کیوں پیدا ہوئی۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ انارکلی کچھ سمجھ نہ سکتی تھی''۔

کسی خیال سے بھی اس کے دل کو ڈھارس نہ بندھی تھی۔ وہ دلکش خیالات سوہان روح ہو رہے تھے۔ اور کسی طرح اس کو اس آفت سے نجات ملنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر اس انتہائی تکلیف میں اس کے خیالات شہزادہ سلیم کی جانب رجوع ہوئے۔ آہ! کیا سلیم سے یہ ہوگا کہ اپنی

انارکلی کو اس طرح اس خوفناک موت کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دے۔ کیا سلیم کوئی تدبیر نہ نکالے گا۔ اب اس کے دل میں ایک نیا خیال آیا۔ کیا واقعی سلیم کو مجھ سے محبت تھی؟ یا میں محض شہزادہ کے دل بہلاؤ کا سامان تھی۔ اور اب وہ مجھے بالکل بھول گیا ہے۔'' اس خیال کی تکلیف انارکلی کو موت سے زیادہ جاں گزیں تھی۔ یہ خیال کہ سلیم کو واقعی اس سے محبت تھی۔ انارکلی کو موت سے زیادہ تکلیف دہ اور روح فرسا تھا۔

ششم

ابھی وہ انہی خیالوں میں محو تھی کہ آنے والے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز اسے سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک سنتری مشعل لیے ہوئے نظر پڑا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی آرہا تھا۔ یہ سلیم تھا۔ سلیم اور انارکلی گرمجوشی کے ساتھ ایک دوسرے کی آغوش میں مقفل ہوگئے۔ سنتری نے یہ حالت دیکھی تو مشعل کو کونے میں رکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ انارکلی اور سلیم خاموش روتے رہے۔ انتہائے غم کی حالت تھی۔ اور خون کے آنسو آنکھوں سے نکل رہے تھے۔ بڑی دیر تک ان کے حواس قابو میں نہ آئے۔

آخرکار سلیم نے کہا۔ ''میری جان! دل مضبوط کرو۔ اب بھی میں تم کو بچا سکتا ہوں۔ آؤ۔'' انارکلی نے متعجب اور استفہامیہ انداز سے سلیم کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ سلیم نے کہا میں نے اپنے اور تمھارے یہاں سے بھاگ چلنے کا انتظام کیا ہے۔ اب دیر نہ کرو۔ وقت جاتا ہے۔ میں نے یہاں سے کچھ فاصلہ پر گھوڑے لگا رکھے ہیں۔ صبح تک ہم لوگ کوسوں دور نکل گئے ہوں گے۔ ہم لوگ بھیس بدل کر چلیں گے تاکہ کوئی ہم کو پہچان نہ سکے۔''

انارکلی: ''اب ہم بھاگ نہیں سکتے۔ لوگ ضرور ہماری تاک میں ہوں گے۔ ہمارا تعاقب کیا جائے گا۔ اور ہم پکڑ لیے جائیں گے۔ آپ میرے لیے اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔''

سلیم: میری جان! ہمارے آدمی بہت ہی چلتے ہوئے ہیں۔ وہ تعاقب کرنے والوں کو بھرّ ادے کر دوسرا راستہ بتادیں گے۔ گھوڑوں کے سُم ربڑ سے مڑھے ہوئے ہیں تاکہ ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز دور تک نہ جاسکے۔
لیکن پیاری! اب جلدی کرو۔ ہر لحہ ہماری دشواریاں بڑھ رہی ہیں۔

لیکن انارکلی نے توقف سے کام لیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کو کوئی حق سلیم کی جان کو خطرہ میں ڈالنے کا نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس جگہ سے محفوظ بھاگ جانا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا: میرے پیارے سلیم! میری تقدیر کا لکھا ہو کر رہے گا........خداوند نعمت بادشاہ کی مرضی ہے۔ کہ میں زندہ نہ رہوں۔ اس لیے اب میرے لیے یہی اچھا ہے کہ میں اب زندہ نہ رہوں۔ میں اب کہیں نہ جاؤں گی۔ میں اب اسی کوٹھری میں پڑی رہوں گی اور اطمینان سے اپنی موت کا انتظار کروں گی۔

سلیم کو سخت تعجب ہوا۔ اس نے کہا: میں ظالم بادشاہ کے ہاتھوں مارے جانے کے لیے تم کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ آخر یہ کیا جنون ہے۔

سلیم نے پھر زور دیا کہ انارکلی اس کے ساتھ بھاگ جانے پر رضامند ہو جائے لیکن انارکلی نے اس کو پسند نہیں کیا۔

انارکلی: میرے جان و دل کے مالک! میرا وقت آ گیا ہے اور میری قسمت میں جوانا مرگ لکھی ہے۔ تقدیر کا لکھا ہو کر رہے گا۔ اس میں کسی کا کیا اختیار۔ میرے لیے یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرنا نامناسب بھی ہے۔ آپ میرے ساتھ کیسے چلیں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم لوگ پکڑ نہ لیے جائیں۔ آپ نے کچھ سوچا بھی ہے کہ یہاں سے آج ہم لوگوں کے بھاگ جانے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ میرے لیے سزائے موت کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اب میں یہاں سے کہاں جا سکتی ہوں۔

سلیم: میری جان! میں تم کو کہاں تک سمجھاؤں یہ بھی کوئی نصیحت و فہمائش کا وقت ہے۔ میں

بادشاہ کے اس ظالمانہ برتاؤ کو برداشت نہیں کرسکتا۔اب میرے لیے سوائے اس کے
کہ میں اس کی نافرمانی کروں کوئی صورت باقی نہیں ہے۔آخر ایک نہ ایک دن مجھے
دہلی کا تخت میسّر ہوگا۔"

انارکلی نے اس کی بات سُنی لیکن جواب نہ دیا۔شہزادے کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ انارکلی کیوں اس وقت بھاگ جانے سے انکار کیے جارہی ہے۔آخر وہ کیوں جیل خانے سے بھاگ جانے کا ارادہ نہیں کرتی اور جان بوجھ کر موت کے مُنہ میں سماجانا چاہتی ہے۔

یہ دیکھ کر کہ قیمتی وقت رائیگاں ہورہا ہے۔سلیم بار بار انارکلی کو وہاں سے بھاگ جانے کی ترغیب دے رہا ہے لیکن انارکلی انکار ہی کیے جارہی ہے۔اور اپنی قسمت کے فیصلہ پر بالکل قانع معلوم ہوتی ہے۔انارکلی کو منظور نہ تھا کہ وہ اپنے بادشاہ کے خلاف مرضی کام کرے۔سلیم ایک محبوبانہ جوش سے چلّا اٹھا۔"انارکلی آخر تم یہاں سے بھاگ چلنے سے کیوں انکار کررہی ہو۔بغیر تمھارے میں کیوں کر زندہ رہ سکتا ہوں۔اگر تم نہ ہوگی تو میں بھی دنیا میں رہ کر کیا کروں گا۔اگر تم میرے ساتھ نہ آؤ گی تو میں اس جیل خانہ سے باہر نہ جاؤں گا۔

اب انارکلی کے ارادہ کی پختگی میں بھی تغیر پیدا ہو چلا۔اُس نے مضمحل آواز سے پوچھا۔"کیا ابھی دیر نہیں ہوئی۔کیا ابھی ہم لوگوں کو یہاں سے بھاگ جانے کا موقع ہے"۔سلیم نے اس کو یقین دلایا کہ ایسی بہت دیر نہیں ہوئی اور دونوں کے بھاگ جانے کے لیے وقت کافی ہے۔اتنا کہتے کہتے سلیم نے انارکلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔اور اس کو زندان سے نکال لے جانے کی کوشش کی۔اسی اثنا میں دروازہ بہت زور سے کھڑکا۔اور ایک خوفناک یعنی خوفزدہ شخص قریب قریب بے حواسی کے عالم میں کمرہ کے اندر داخل ہوا۔کچھ دیر تک وہ وہاں کھڑا ہانپتا رہا۔آخر جب اس کا دم راست ہوا تو اس نے کہا"حضور! بادشاہ سلامت اس طرف تشریف لاتے ہیں۔"

سلیم چونک پڑا۔اور بے حواس ہو کر پوچھا۔اب کیا کرنا چاہیے؟

رحیم خاں: اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔حضور اس وقت جیل خانہ سے باہر چلے

جائیں۔ پھر تشریف لے آئیں۔"

سلیم: رحیم خاں! تم یہاں پر ٹھہرو۔ میں آتا ہوں۔"

فوراً شہزادہ نے چوکیداروں کی پوشاک جو وہ ساتھ لایا تھا پہنی اور انارکلی کو آغوش میں لے کر کہا۔ "میری جان تم ذرا دیر یہیں ٹھہرو۔ لیکن تیار رہنا میں ابھی آتا ہوں۔ انارکلی نے اس کی طرف مایوسانہ انداز سے دیکھا لیکن اس کی زبان سے آواز نہ نکل سکی۔

سلیم نے سر اٹھایا۔ جھک کر انارکلی کی پیشانی کا بوسہ لیا اور مشعل گل کر کے چلا گیا.... انارکلی ہل نہ سکی۔ وہ کچھ بھی زبان سے نہ کہہ سکی۔ یہاں تک کہ وہ شہزادہ کے بوسہ کا جواب بھی نہ دے سکی۔ شہزادے کے جانے پر اس کی رہی سہی امیدیں بھی رخصت ہو گئیں اور آخر کار کوٹھری کی خوفناک تاریکی نے پھر ناامیدی کی شکل روبرو پیش کر دی۔

انارکلی کی کوٹھری میں کوئی نہ آیا۔ رحیم خاں نے جھوٹ کہا تھا۔ نہ بادشاہ تھا نہ اور کوئی۔ شہزادہ کے جانباز دوستوں کا ایک گروہ تھا جس میں رحیم خاں بھی شریک تھا۔ جب ایک بار شہزادہ نے بادشاہ کی زندگی ہی میں علم بغاوت بلند کرنے کی تیاری کی تھی تو رحیم خاں ان لوگوں میں تھا جنھوں نے شہزادے کا ساتھ آخیر دم تک دینے کا وعدہ کیا تھا۔ رحیم خاں جیل خانہ کا داروغہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلیم محض انارکلی سے الوداع کہنے آیا ہے۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ وہ انارکلی کو وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کرے گا۔

جب سلیم کمرہ میں داخل ہوا تو رحیم خاں کو یہ شوق ہوا کہ دیکھو اس نازک وقت میں جذبات محبت کے متوالوں میں کیا بات چیت ہوتی ہے۔ وہ دروازہ کے پاس آ کھڑا ہوا اور اس نے ان کے وہاں سے بھاگ جانے کی تجویزیں سن لیں۔ جب رحیم خاں نے دیکھا کہ وہ انارکلی کو وہاں سے لے جانے کی فکر میں ہے تو اس نے جان بوجھ کر اس کو روک دینا چاہا۔

آخر وہ کیا کرتا۔ اگر قیدی کو وہ بھاگ جانے دیتا تو اس کی جان خود خطرہ میں پڑ جاتی۔ لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ کھلم کھلا شہزادہ کو ناخوش کر دے۔ بادشاہ بڈھا تھا اور سلیم جلد ہی بادشاہ ہونے والا

ہے۔اس لیے رحیم خاں نے سوچا کہ ایسی تدبیر ہو کہ کام بھی نکل جائے اور شہزادہ ناخوش بھی نہ ہو۔

جب سلیم باہر آیا تو رحیم خاں نے دو مشعلیں جلتی ہوئی دکھائیں۔ یہ اس کے آدمی لیے جا رہے تھے۔ سلیم نے پھران کی طرف دیکھا۔ نہ وہ انارکلی کو چھوڑنا چاہتا تھا نہ بادشاہ کے خلاف کھلم کھلا کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔

رحیم خاں نے سلیم کو گلیوں اور سڑکوں سے ہوتے ہوئے شہزادہ کے محل تک پہنچا دیا۔

سلیم: "رحیم خاں! تم ٹھیک جانتے ہو کہ وہ بادشاہ ہی تھا۔"

رحیم خاں: "جی حضور"۔

شہزادہ: "آخر وہاں بادشاہ کیسے تشریف لائے؟"

رحیم خاں: حضور کو معلوم ہوگا کہ اکثر بادشاہ سلامت جیل خانوں کا معائنہ کرنے بغیر اطلاع کے تشریف لاتے ہیں۔

سلیم: "ہاں اتنے دنوں تو بادشاہ نے لوگوں کو تعجب میں ڈالا ہے۔ اب اس بار وہ خود متعجب ہوگا۔" سلیم نے یہ فقرہ نہایت معنی خیز انداز سے کہا تھا۔

رحیم خاں اب سخت متحیر تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ کچھ دیر میں شہزادہ انارکلی کو جیل خانے سے نکال لے جانے کی غرض سے پھر وہاں جائے گا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ وہ قیدی کا قید خانہ سے نکل جانا روا نہ رکھتا تھا۔

رحیم خاں: حضور کی اجازت ہو تو غلام تھوڑی سی شراب پیش کرے۔ سلیم کا حلق مارے غصہ کے خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "خیر ذرا سی شیرازی لے آؤ"۔

رحیم خاں وہاں سے گیا۔ اور تھوڑی سی شراب لے آیا۔ اور کمر بند سے ایک پُڑیا نکال کر شراب میں گھول دی۔ یہ ایک سفید رنگ کا سفوف تھا۔ شراب میں کچھ جھاگ پیدا ہوا اور پھر اپنی حالت پر آ گئی۔

سلیم شراب کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ رحیم کا پیالہ پیش کرنا تھا کہ شراب سلیم کے حلق کے نیچے

تھی۔تھوڑی اور لاؤ۔رحیم خاں اور شراب لایا۔اور سلیم نے پھر غٹ غٹ پی لی۔اب شراب نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا۔اس نے مجنونانہ جوش سے کہا۔رحیم! رحیم! مجھے انارکلی کے پاس لے چلو!۔

رحیم: ''حضور غلام کو کوئی عذر نہیں ہے.....لیکن.......

سلیم: لیکن۔لیکن کیا؟

رحیم: ممکن ہے کہ بادشاہ ابھی وہیں ہوں۔

سلیم: بھائی جان! بادشاہ کو چوکیدار کے گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔
وہ بادشاہت کے قابل نہیں ہے، دیکھو اس وقت بادشاہ کہاں ہے۔''

رحیم نے سرِ تسلیم خم کیا۔اور وہاں سے چل دیا۔اس کو یقین تھا کہ شہزادہ صبح تک ہوش میں نہ آئے گا۔

ہفتم

انارکلی سلیم کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔لیکن سلیم نہ آیا۔انتظار نے اسے سخت پریشان کیا۔ لیکن امید نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔وہ یہی سوچتی رہی کہ ممکن ہے کہ سلیم اب بھی آتا ہو۔

صبح کا سپیدا (سفیدی) جھلک رہا تھا۔اور انارکلی کے تنگ حجرہ کی تاریکی اب کم ہو چلی تھی۔ دفعتاً اس کو قریب ہی کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔یہ وہی انگوٹھی تھی جو انارکلی کی ماں نے اس کو دی تھی، تو کہا تھا ''خدا نہ کرے بیٹی تجھ کو کبھی اس کے استعمال کی ضرورت ہو۔لیکن جب دنیا میں امید کی دھندلی سی روشنی بھی باقی نہ رہے اور مستقبل بالکل تاریک نظر آئے تب اس کو چاٹ لینا۔انارکلی کو آج اپنی ماں کی باتوں کے معنی معلوم ہوئے۔اس نے انگوٹھی اٹھا کر ہیرا اپنے مُنہ میں رکھ لیا۔ فوراً اپنے بچپن کا زمانہ اور اُس کی ماں کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔پھر سلیم کی محبت کے جذبات بھی اس کے دل میں موج زن ہونے لگے اس کے بعد از خود رفتگی شروع ہو گئی۔تھوڑی

ہی دیر میں انارکلی وہاں تھی جہاں سے کوئی خبر نہیں آتی۔

اب سر ہاتھ پر رکھے انارکلی اس سخت اور ٹھنڈی چٹان پر پڑی ہوئی تھی۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہے اور اس کی آنکھیں نیم باز تھیں۔

جب بادشاہ کے آدمی وہاں پہنچے کہ اس کو سزائے موت دیں تو پہلے دروازہ کھولنے میں کچھ تامل ہوا۔ جب دروازہ کھلا تو آفتاب کی روشن کرنوں نے انارکلی کے چہرہ کو منور کر دیا۔ وہ ایک حسن کی دیوی تھی۔ وہ واقعی انارکلی تھی اور اس کا نام اب بھی اس کے رخساروں اور ہونٹوں کے حسن پر پھبتا تھا۔

ہشتم

خاندان بابر کا سب سے زیادہ شاندار بادشاہ اب جنت میں آرام کرتا ہے۔ اور سلیم تخت شاہی پر نورالدین جہانگیر کے نام سے جلوہ افروز ہے۔

انارکلی کی موت کا واقعہ اس شکستہ دل عاشق کے دل سے محو ہو چکا ہے۔ اب اس نے عیش و عشرت کے دوسرے پیالوں کی چاشنی چکھ لی ہے۔ اس نے مہرالنساء کو دیکھا ہے۔ اور مہرالنساء کی محبت کے سامنے انارکلی کا عشق اُس سپاہی جیسا ہے جیسے نصف النہار پر چمکتے ہوئے آفتاب کے آگے جگنو کی چمک بے بضاعت اور حقیر معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی مہرالنساء ہے جسے دنیا نور جہاں کے نام سے جانتی ہے۔ اب بادشاہ کے دل و دماغ پر سوتے جاگتے نور جہاں ہی کا قبضہ ہے۔

شام کا وقت تھا جہانگیر شاہی باغیچہ میں ٹہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حیف! اب تک میری اس سچی محبت پر بھی مہرالنساء کا دل نہیں پسیجتا۔

وہ ٹہل ہی رہا تھا کہ یکا یک اس کی نگاہ ایک انار کے گچھے پر جس میں پھول کھلے ہوئے تھے اور کلیاں لگی ہوئی تھیں اور ایک چھوٹی سی قبر پر پڑی اس نے قبر کو اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس میں کون دفن ہے۔ ایک بوڑھا مالی کچھ فاصلہ پر پھولوں کی کیاری میں کام کر رہا

تھا۔ جہانگیر نے اسے بلایا اور پوچھا۔ یہ کس کی قبر ہے۔ مالی نے پہلے قبر کی جانب دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر بادشاہ کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔ وہ گھبرا اُٹھا۔ اس کا دل خوف زدہ ہو گیا۔ شہزادے نے پھر پوچھا: ''اس میں کون دفن ہے؟'' باغبان نے رکتے رکتے کہا:

''انارکلی بیگم''

'انارکلی' ۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل میں پُرانے خیالات تازہ ہو گئے ۔ اس نے مغرب کی جانب نگاہ کی ۔ ایک چمک دار ستارہ افق سے اوپر چڑھ رہا تھا، اور اسی کے ساتھ انارکلی کی یاد بادشاہ کے دل میں ترقی کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ مہرالنساء کو بھی بھول گیا جس طرح کئی سال ہوئے............ انارکلی کو اس نے دیکھا تھا۔ وہی صورت اس کی نظروں کے سامنے پھر گئی۔ اس کی قابلِ تاسف موت کے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس کو انارکلی کا تبسم یاد آ گیا، جس کی ادنیٰ قیمت جہانگیر یا سلیم کی جان تھی۔ اسے رحیم خاں کی دعا بھی یاد آئی۔

جہانگیر فکر میں ڈوب گیا۔ آہستہ آہستہ وہ محل کو واپس چلا۔

دوسری صبح کو داروغۂ عمارات کو حکم ہوا کہ وہاں ایک عالیشان عمارت تعمیر کر دی جائے اور یہ شعر اس عالیشان عمارت پر کندہ کر دیا جائے۔

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را

کتابیات

1۔ ارباب اردو، اسماء رفعت، لاہور۔

2۔ اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شاعروں کا حصہ، گنپت سہائے سریواستو، لکھنؤ۔

3۔ اردو شاعری: تنقید و تجزیہ، صغیر افراہیم۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2012

4۔ انصاف کا خون، سرتبہ ظفر قدوائی، نظامی پریس، لکھنؤ، 1979

5۔ باقیات رواں، سرتبہ محمد نسیم خاں، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، 1986

6۔ ایضاً ظفر قدوائی، نظامی پریس، لکھنؤ، 1980

7۔ تذکرے اور تبصرے، جلیل قدوائی۔ اردو اکادمی، سندھ، بندر روڈ کراچی، 1959

8۔ تذکرے شعرائے اترپردیش، عرفان عباسی، نامی پریس، لکھنؤ، 1982

9۔ جگر مرادآبادی: حیات اور شاعری، ڈاکٹر محمد اسلام، لکھنؤ۔

10۔ جگت موہن لال رواں، سلیمان اطہر جاوید، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 2013

11۔ ایضاً : حیات اور ادبی خدمات، ظفر قدوائی، مکتبہ تعمیر ادب، صفی پور، ضلع اناؤ، 1981

12۔ خریطۂ جواہر، جگت موہن لال رواں، مرتبہ ظفر قدوائی، پربھان شنکر سروش، صدر بازار، اناؤ، 1979

13۔ رباعیاتِ رواں، عطر چند کپور، اردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور، 1951
14۔ روحِ رواں، جگت موہن لال رواں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1983
15۔ سازِ سخن، کاشی ناتھ ملہوترا، اردو مرکز، پنجاب
16۔ نقدِ رواں بہ اہتمام خواجہ قمر الدین، نامی پریس، لکھنؤ۔ ستمبر 1951

رسائل

1۔ ماہنامہ "بزم سہارا" دہلی، دسمبر 2010
2۔ ماہنامہ "بزم سہارا" دہلی، اگست 2011
3۔ ماہنامہ "اردو دنیا" نئی دہلی، مئی، 2012
4۔ ماہنامہ "اردو دنیا" نئی دہلی، اپریل، 2014
5۔ شعر و حکمت، حیدرآباد، مارچ، 2008
6۔ فکر و نظر، علی گڑھ، ستمبر، 2009
7۔ آرٹس فیکلٹی جرنل، علی گڑھ، 2010-2009
8۔ تحریکِ ادب، بنارس، شمارہ نمبر 13، 2012

جگت موہن لال رواں اپنے عہد کے ممتاز شاعر، مقبول رباعی گو، ماہر قانون اور افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے نظموں، غزلوں اور رباعیات میں ہی نہیں قطعات میں بھی اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھائے اور شوکتِ الفاظ، تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کے برمحل استعمال سے اپنی خلاقی کا ثبوت دیا۔ رواں کو اردو میں منفرد رباعی گو کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ 14 رجنوری 1889 کو اناؤ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ سے ایم۔اے۔، ایل۔ایل۔بی۔ کرنے کے بعد آبائی وطن میں وکالت شروع کی۔ شعروادب سے لگاؤ ورثہ میں ملا تھا۔ عزیزؔ لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اور ان کا شمار عزیزؔ لکھنوی کے اہم ترین شاگردوں میں ہوتا ہے۔

مونوگراف کے مصنف ڈاکٹر صغیر افراہیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مدیر ہیں۔ وہ ''رفتار'' اور ''دانش'' کے بھی مدیر رہ چکے ہیں۔ آبائی وطن اناؤ ہے جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مکمل کی۔ 10 کتابیں اور 200 مضامین منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ''پریم چند ـــــ ایک نقیب''، ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل''، ''نثری داستانوں کا سفر'' اور ''اردو شاعری: تنقید و تجزیہ'' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

ISBN 978-93-5160-098-5
ISBN 935160098-X
9 789351 600985

₹ 86.00

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ۔ 110025